نوے روزہ

چاند

جنوری تا مارچ ۲۰۲۳ء



نوے دنوں کی مسکراہٹوں اور قہقہوں کا راشن

جنوری تا مارچ ۲۰۲۳ء

e چاند

قیمت

۵x۱۰۰ دعائیں





برقی گھوڑے دوڑانے کے لیے

mudeerchand@gmail.com


یہ وہاں ہے

جعلی دانش ور



اچھی بھلی ہماری باتیں مہنگائی کے عذاب پر ہو رہی تھیں کہ حسب معمول میے پھکری نے چول ماردی۔ اگرچہ یہ چول اتنی بڑی نہیں تھی لیکن اس پر جس طرح حکیم نوشادری نے ردعمل دیا تھا، ہم سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ ہمیں مجبوراً یہ سمجھنا پڑا کہ یہ جو چول ماری گئی ہے یہ کافی بڑی ہے۔ ظاہر ہے، اب میے پھکری کی چول پر بحث ومباحثہ تو ہونا تھا۔ سو بات کا آغاز حکیم نوشادری ہی نے کہا

''میے ...... جس طرح تم چول ہو، اسی طرح کی بڑی چول تم نے ماری ہے۔ یہ تمھیں مان لینا چاہئے۔''

''اوئے سونف اور ہریڑ ملا کر کینسر کا علاج کرنے والے جعلی سائنس دان، میں نے حقیقت بیان کی ہے، اب بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو اس میں ہمارا کیا قصور؟''

حکیم ایک دم سے تلملا کر بھڑک اٹھا۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے غصہ جعلی سائنس دان پر آیا تھا، یا ہریڑ اور سونف کے کامبی نیشن پر۔ اس نے بھڑکتے ہوئے کہا

''تم جیسے لوگ ہوتے ہیں، جو سماج دشمن عناصر ہوتے ہیں، جو خود تو عقل وشعور نہیں رکھتے بلکہ رائے کی ہمواری میں بے جا دخل اندازی کرکے، اپنی نیم پختہ قسم کی دانشوری سے عوام الناس کو بھٹکا دیتے ہو۔''

''میں اپنی بات پر اب بھی قائم ہوں، بھلے باقی سب سے پوچھ لو۔'' میے نے لاپرواہی سے کہا اور ہم سب کی طرف دیکھا۔

اس شام تھڑے والا کورم پورا تھا۔ بالا سودائی، میا پھکری، شیدا ٹلی، حکیم نوشادری اور خاکسار بھی حاضر تھے۔ بازار کی تقریباً سبھی دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اس لئے ان کا تھڑا ایک ایسی دوکان کے باہر لگ چکا تھا، جہاں زنجیر سے بندھا ہوا یہ بینچ بھی پڑا تھا۔ اگرچہ لکڑی کا یہ بینچ چھوٹا تھا لیکن کافی مضبوط لگ رہا تھا۔ اس پر منحنی بدن والا میا پھکری، بڑی توند والا شیدا ٹلی اور لمبے قد والا حکیم نوشادری براجمان تھے، جبکہ دوکان کے سیمنٹ والے پکے تھڑے پر میں اور بالا سودائی بیٹھے ہوئے تھے۔ چونکہ بات اب تھڑے پر باقاعدہ پیش ہو چکی تھی، اس لئے باقی ارکان تھڑا کا بحث ومباحثہ کرنا بنتا تھا۔ تبھی میں نے دخل در معقولات کرکے باقاعدہ آگ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے تحمل سے کہا

''ایک منٹ حکیم صاحب ...... میے نے صرف اتنا کہا ہے کہ مارکیٹ میں جعلی اشیاء خورد نوش کی طرح دانشور بھی جعلی آ گئے ہیں۔ اس پر آپ اتنا کیوں بھڑکے؟''

''مجھے اعتراض یہ ہے کہ ...... جس طرح ڈگری ...... ڈگری ہوتی ہے، وہ اصلی ڈگری ہو یا جعلی ڈگری ہو...... اس طرح دانشور

ہمیشہ دانشور ہوتا ہے بھلے جیسا بھی ہو۔'' اس نے لرزتی آواز میں کہا

''اب اس کی عقل کا اندازہ لگا لو.....لگتا ہے اس نے نیلا تھوتھا سونگھ لیا ہے۔ اسکے ہوش ٹھکانے پر نہیں ہیں۔ اسے جعلی دانشور کا نہیں پتہ......'' میمے پھکری نے کہا

''جعلی دانشور تو وہ ہوتا ہے نا، جو خود جاہل ہو لیکن اپنے آپ کو دانشور بنا کر پیش کرتا ہو۔ بھئی ہو دانش ور تو نہ ہوا مطلب وہ عقل والا تو نہ ہوا۔'' شیدے ٹلی نے لب کشائی کی تو حکیم پھڑک کر بولا

''ابے تم لوگوں کی عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ اب دیکھو ......جو کامیاب شخص ہوتا ہے وہ بھلا بے وقوف ہو سکتا ہے، جاہل ہو سکتا ہے؟'' حکیم نے منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے کہا

''نہیں، وہ تو بہت عقل مند ہوتا ہے۔'' شیدے ٹلی نے دیدے باہر نکال کر اس کی بات کی باقاعدہ تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا تاکہ وہ گرمی کھا جائے۔

''میں تو ہر کامیاب بندے کو عقل مند سمجھتا ہوں۔'' اس نے ٹانگیں پسار کر اپنی پنڈلی کھجاتے ہوئے کہا تو میمے نے دردمند لہجے میں پوچھا

''دیکھو، مجھے ایک بات کا جواب دو۔ جعلی دانشور بھلا دانشور کیسے ہوتا ہے؟''

''ابے گھامڑ......جعلی دانشور اپنی دانشوری کا سکہ بٹھانے کے لئے، کسی دانشور کی باتوں کا ہی سہارا لے گا نا، وہ بھلے کوئی بھی ہو، باتیں تو دانشوروں والی کرے گا نا۔''

''اس کی کوئی مثال ہے تمہارے پاس؟'' میمے نے جز بز ہوتے ہوئے پوچھا

''بالکل ...... یہ جتنے موٹیویشنل اسپیکرز ہیں، یہ کیا ہے...... ادھر اُدھر کے دانشوروں کی باتیں اکٹھی کر کے اپنے برتن میں ڈالتے ہیں، انہیں خوب ہلا کر آمیزہ تیار کرتے ہیں، اب وہ معجون بنتی ہے یا پھکی......جو بھی بنے عوام کے سامنے لا رکھتے ہیں، اپنی رقم بٹورتے ہیں اور کامیاب ہیں۔'' حکیم نوشادی نے اپنی بات مکمل کر کے یوں سب کی طرف دیکھا جیسے ابھی اس پر بھی نوٹ نچھاور ہو جائیں گے۔

''اوئے میمے تم تو نرے پاگل ہو......'' بالے سودائی نے کہا

''لو اس کی بھی سن لو......اوئے جاگ گئے ہو تم......'' میمے نے طنزیہ پوچھا

''ارے ہم ہی تو جاگ رہے ہیں، ورنہ کب کا سماج لٹ چکا ہوتا۔'' بالے سوادئی نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا پھر چند ایک لمبی جماہی لے کر بولا ''دراصل آج کل یہی مارکیٹ میں آنے والے جعلی دانشور ہی عزت و مرتبہ اور مقام پا رہے ہیں۔ انہیں پتہ چل چکا ہے کہ مارکیٹ میں کیا چل رہا ہے۔ کیونکہ آج کل جہاں عقل ہے وہاں پیسہ نہیں اور جہاں پیسہ ہے وہاں سب کچھ ہے......تم سنا نہیں جس کے گھر دانے، اس کے پاگل بھی سیانے......''

''کیا عقل پیسے سے خریدی جا سکتی ہے بھلا؟'' میمے نے احتجاجی لہجے میں پوچھا

''اوئے ہاں عقل کے دشمن...... ہاں......وہ تم نے اپنے جیدے ڈھب کو نہیں دیکھا، جو خود کو بڑا افسانہ نگار کہتا ہے۔'' بالے سوادئی نے کہا تو مجھے یاد آیا، اس کی تو افسانہ نگاری میں کئی ساری کتابیں آ گئی تھیں۔ سو میں نے ذرا اپنے آپ کو پڑھا لکھا ثابت

کرنے کا موقع مل جانے پر تیزی سے کہا

''ہاں جی ہاں......سنا ہے وہ بڑا افسانہ نگار ہے۔ بڑا دانش ور ہے۔''

''اوئے بچوں سے چیزیں چھین کر کھانے والے سن......'' بالے سواوئی نے میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا

''ہاں سنا......'' میں تلملاتے ہوئے کہا

''وہ پیسے دے کر لکھواتا ہے۔ رقم بھر کے کتابیں چھپواتا ہے، پھر خود سرمایہ کاری کر کے اپنی کتابوں کی رونمائی کرواتا ہے۔ جو اس پر لمبے چوڑے مقالے لکھتے ہیں اور اسے دانشور ثابت کرتے ہیں، وہ بھی معاوضہ لیتے ہیں۔ تو بتاؤ دانش ور ہوا کہ نہیں ہے''

''بالے بھائی یہ تو گھر پھونک تماشہ دیکھنے والی بات ہے نا، خود سے پیسہ......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا

''بات یہیں نہیں رکتی......وہ پیسے دے کر ایوارڈ بھی لیتا ہے۔ مشہور ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کو بڑے اعلیٰ اعزاز سے بھی نوازا جائے گا......اسی مشہوری کا فائدہ اٹھا کر وہ بڑے بڑے ٹھیکے لیتا ہے، کرپشن کی رقم ہضم کرتا ہے۔''

''یہ کیا سائنس ہوئی بھلا؟'' میں نے پوچھا

''جس دن تمہیں یہ سائنس سمجھ میں آ گئی، تم بھی دانشور بن جاؤ گے۔'' بالے سواوئی نے حتمی لہجے میں کہا اور تھڑے پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ جیسے ابھی مراقبے میں چلا جائے گا۔

''سن لے میرے......تم نے چول ماری ہے۔'' حکیم نے یوں کہا جیسے کوئی اینٹ مار کر بدلہ لیتا ہے۔

''میری بات چول کیسے ہوگئی؟'' اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''دیکھ ملک میں ملاوٹ کا قانون ہے لیکن ہر طرف ملاوٹ والی چیزیں بک رہی ہیں کوئی روکنے والا نہیں، اس طرح جعلی دانشور کو کوئی روک نہیں سکتا، سو یہ بھی اصلی دانشوروں کا توڑ ہیں۔ دانش ور بس دانش ور ہے۔'' حکیم نے کہا اور اٹھ کر میداں پچھے کٹنی کی طرح ہاتھ ہلا کر بولا، ''اب تو عالمی سطح پر جعلی دانشوریت جاری ہو چکی ہے جسے فیک انٹیلی جنس کہتے ہیں۔ روک سکو تو روک لو......''

تھڑے پر کوئی بھی بات نہ کر سکا۔ سو حکیم نوشادری فاتحانہ انداز میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔



احسان دانش کو کسی شہر سے مشاعرے والے مدعو کرنے آئے۔ احسان دانش نے رسمی گفتگو کے بعد ہامی بھر لی۔ وہ لوگ چلے گئے تو احسان دانش کے ایک چہیتے شاگرد ایوب شاہد نسیم آ گئے۔ انہوں نے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ احسان دانش نے منتظمین مشاعرہ کو ٹیلی گرام بھیجا "میرے ساتھ ایوب شاہد نسیم بھی آ رہے ہیں۔"

دوسرے ہی دن منتظمین کا جوابی تار آ گیا، جس میں لکھا تھا "معاف کیجئے گا ہمارا بجٹ کم ہے۔ لہٰذا ہم آپ کے بتائے ہوئے ان تینوں شاعروں کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتے!"

شرارتی لکیریں

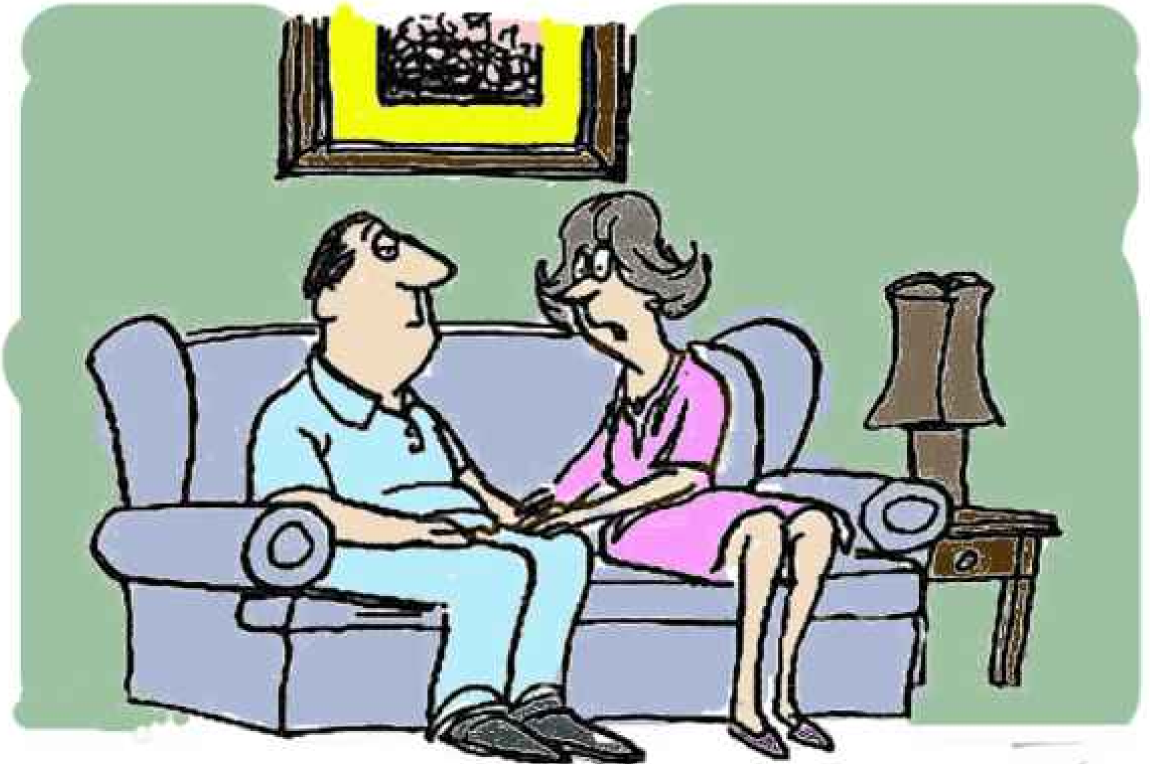




طویل تقریر کا غیر حتمی، غیر سرکاری نتیجہ



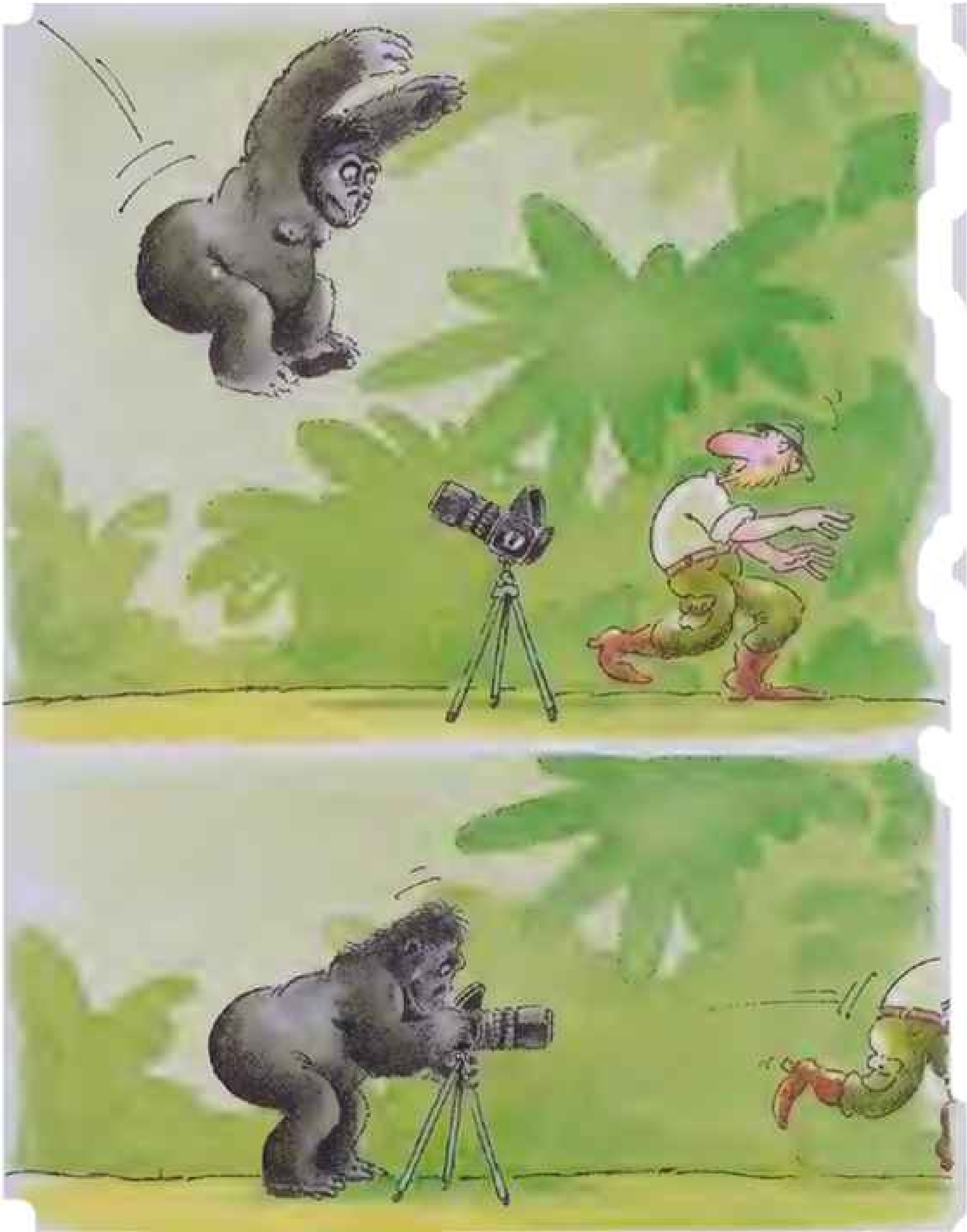
مجھے کام بتاو میں کیا کروں میں کس کو کھاوں!



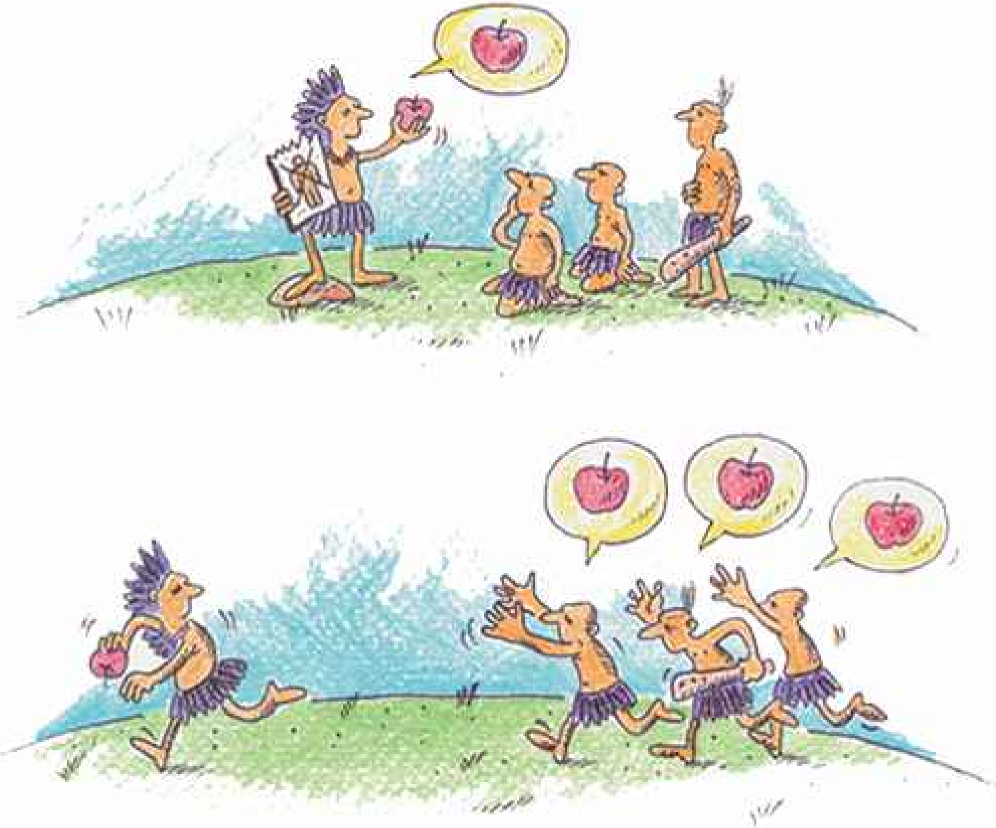
نہیں جانو! میں تمہیں تو بُرا نہیں کہہ رہی، تم تو بہت اچھے ہو!
یہ تو تمہارے اندر کی خباثت ہے جو مجھے زہر لگتی ہے!!



دوڑ میری شہزادی ــــ دوڑ! دوڑ!!



پاکستان کے طاقتور حلقوں کا سیاسی شغل۔

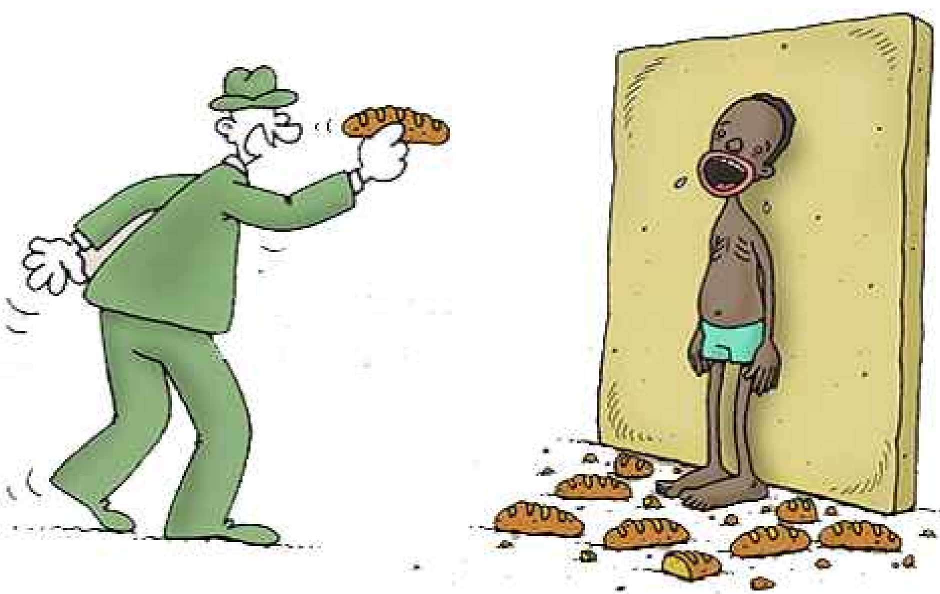


سیاست دان اور عوام



پردیس کو جانے والے ___

بیوی ہر چیز کو مکمل طور سمجھنا چاہتی ہے سوائے شوہر کے۔ (آخری درویش)



آئی ایم ایف اور غریب ممالک



کہ یہ ماڈرن دور ہے ـــ



اچھا ۔ تو ہمارے ساتھ چالاکیاں !!



میرے شوہر شکاری ہیں، وہ آؤٹ ڈور کی طرح اِن ڈور بھی ہوں تو شکاریوں کا چینل ہی دیکھتے ہیں!



بجٹ ڈار مارکہ ہو تو سُن کر چکر آ ہی جاتا ہے۔

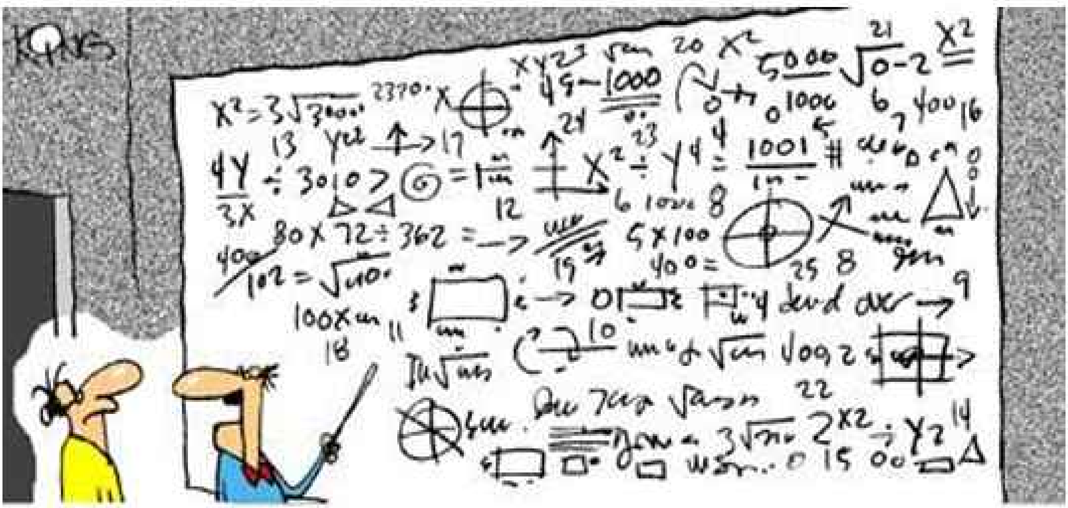


پپا جب تک میرا ہوم ورک مکمل نہیں کر لیتے، کھیلنے کے لئے نہیں جا سکتے!

میری بہت سی بیویاں ہیں پھر میں کیسے امیر ہو سکتا ہوں۔ (بابا شوقی)



اُن کی سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے



دیکھ لیجئے، سگریٹ نوشی چھوڑنا کتنا آسان ہے!



کبھی محبت تھی، اب تو آزار بن گئی ہے
کسی کی شاپنگ کسی کی بیگار بن گئی ہے



ٹی وی ٹھیک نہیں ہوتا تو کچھ بھی کرو
اب بچوں کی روں روں سنی تو خیر نہیں

عابدہ صبا
کرک، خیبر پختونخواہ

باریش ہ وانیاں



ہمارے پیارے ملک پاکستان میں عزت کے کئی پیمانے رائج ہیں جن میں سے سرفہرست پیمانہ ناک ہے۔ عزت کو ناپنے کے لیے اس کا استعمال ہر جائز و ناجائز طریقے سے کیا جاتا ہے اور اسے سب سے مستند ذریعہ سمجھا جاتا ہے لیکن یہ اکثر ہی کٹی پائی جاتی ہے۔

عزت ناپنے کے لیے اکثر اوقات جیب بھی کام آتی ہیں۔ جتنی بھاری جیب ہوتی ہے اتنے ہی وزن دار القابات سے نوازہ جاتا ہے جو بتدریج جیب کے ہلکا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا وزن کھوتے جاتے ہیں اور آخری لقب جو جیب کے خالی ہونے بلکہ پھٹ کر لٹک جانے کے بعد ملتا ہے وہ ہوتا ہے "کھوتے" کا۔

ایک پیمانہ اور بھی ہے جو ہے تو عزت کے لیے مگر لوگ اسے عزت افزائی کے لیے بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور وہ ہے داڑھی۔

داڑھی کی کوئی مخصوص شکل نہیں۔ کبھی یہ مکمل گالوں کو چھپاتی بالشت بھر لمبی دیکھی جاتی ہے تو کبھی اتنی چھوٹی گویا مکھی ہونٹوں پر لگی شیرینی چاٹنے کی کوشش میں ٹھوڑی پر براجمان ہوگئی ہو۔ کبھی ایک باریک خم دار لکیر جو ٹھوڑی اور ہونٹوں کو احاطہ کیے نظر آتی ہے تو کبھی اتنی گھنی کہ شہد کی مکھیوں کے ایک بڑے چھتے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ الغرض نت نئے انداز ہر روز مارکیٹ میں دستیاب ہوتے ہیں جسے بوقت ضرورت اور حسب خواہش استعمال کیا جاسکتا ہے البتہ اسے بار سمجھ کر بوقت حاجت اتارا بھی جاسکتا ہے۔ بس دھیان رہے کہ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے ہی اتارا جائے وگرنہ یک دم اتارے جانے پر گھر میں گھسنے پر اپنی ہی گھر والی سے مار بھی کھائی جاسکتی ہے مغالطے میں۔

کچھ داڑھیوں میں ڈیزائن بنانے کے لیے زیادہ تگ ودو بھی نہیں کرنی پڑتی اور نہ ہی خرچہ آتا ہے۔بس خوب لمبی اور گھنی کریں پھر موٹر سائیکل پر بیٹھ جائیں بغیر ہیلمٹ پہنے۔ ہوا کے زور سے داڑھی کی وہ ریشہ دوانیہ دیکھنے کو ملے گی کہ شاید ہی کہیں اور دیکھنے کو ملے

اس نئے اور بغیر خرچ کیے ڈیزائن سے مستفید ہونے والے حضرت کا شرف دیدار ابھی چند دن پہلے نصیب ہوا۔جن کی سرخ مہندی لگی داڑھی کا ایک حصہ ایک کندھے پر تو دوسرا حصہ دوسرے کندھے پر موجود تھا۔اور درمیان میں جگہ یوں خالی ہوگئی تھی جیسے گرمی میں کھڑکی پر سے پردے دونوں اطراف میں اوپر کی جانب ہٹا کر ہوا کے لیے گزر گاہ بنائی جاتی ہیں یا یوں گویا گھوڑے کی باگ پچھلی سواری کے ہاتھ میں تھما دی جائے۔

داڑھی کو عزت اور عزت افزائی دونوں کے لیے بوقت ضرورت استعمال کیا جاتا ہے۔ایک صاحب کلین شیو رکھنے کے شوقین تھے۔ ایک بار گاڑی کی اگلی سیٹ پر سفر کرتے ہوئے انھوں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھی خواتین کا مردوں پر کیا گیا تبصرہ سنا تو انھیں معلوم ہوا کہ داڑھی رکھنے والے مردوں کو خواتین بلا کسی اعتراض کے عزت دار سمجھتی ہیں جب کہ کلین شیو حضرات کو مسنڈوں کا خطاب دیا جاتا ہے۔بس پھر کیا تھا صاحب نے خوب ذوق وشوق سے داڑھی لمبی کر دی۔ کچھ عرصہ تو داڑھی رکھ کر شریف بنے رہے لیکن ایک دن پھر سے کلین شیو پائے گئے۔ داڑھی منڈھوانے کی وجہ پوچھی گئی تو پتہ چلا کہ صاحب کا پیر گاڑی میں چڑھتے وقت ایک خاتون کے پیر پر پڑگیا۔خاتون نے ان کی خبر لی تو اردگرد کے لوگوں نے ان کی داڑھی کی۔اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے شریف بننے سے مطلب داڑھی رکھنے سے توبہ تائب ہوگئے۔

ایک حضرت سے ان کے ساری عمر داڑھی نہ رکھنے کی وجہ پوچھی گئی تو بولے فائدوں کا تو علم نہیں لیکن داڑھی رکھنے کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ پھر بندے کو لازمی اوپر والے سے ہی لو لگانی پڑتی ہے کیونکہ نیچے والوں بلکہ والیوں سے لو لگانے کی ہر کوشش یہ کہہ کر دار پر چڑھا دی جاتی ہے کہ اس کی داڑھی دیکھو اور اس کی حرکتیں دیکھو۔۔۔۔۔یا پھر جب کبھی کسی شاہکار حسن پر نگاہ پڑے

کرسی کا ڈیزائن

(ایک رُباعی)



اب حلیہ سیاست کا ذرا چور سا ہے
اب ملک کا ماحول ہی کچھ اور سا ہے
منظور ہے منظور ہے منظور ہے ہم کو
کرسی کا ڈیزائن جو اِسی طور سا ہے

نوید ظفر کیانی

اور دل سے اس تخلیق کے خالق کی تعریف کرتے کرتے زبان سے داد نکل جائے تو جو فقرہ سب سے پہلے سننے کو ملتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ اتنی لمبی داڑھی ہے اور کام شیطانوں والا۔ اب انھیں کون سمجھائیں کہ ہم تو مصور کی فن کاری کی تعریف کر رہے تھے۔ لیکن شاید تب بھی یہی جواب ملے "بڑا صوفی بنتا پھرتا ہے"۔

داڑھی رکھنے والوں کی چند مخصوص عادتیں بھی ہوتی ہے جن کے اوپر سال ہا سال تحقیق کرنے کے بعد بھی ان کی منطق سمجھ سے بالاتر ہی رہی ہیں۔ ایک بڑی بی نے ایک دن داڑھی والوں کی ایک عادت کی وجہ بڑی سادگی سے بیان کر دی۔ دراصل ان کے صاحبزادے پولیس کی نوکری میں تھے اور باریش تھے۔ جب کبھی صاحب زادے کسی مہمان سے مصافحہ یا معانقہ کرتے تو داڑھی پر دیر تک ہاتھ ضرور پھیرتے رہتے۔ بڑی بی سے جب اس بابت پوچھا گیا تو بولی "داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرشتوں سے مشورہ کیا جا رہا ہوتا ہے کہ سامنے بیٹھے بندے سے ملاقات کا فائدہ ہوگا یا خالی ہاتھ ہی پھیرتے رہیں گے"

بڑی بی کی بات سے اپنے والد صاحب کی ایک بات ذہن میں آئی۔ ہمارے والد صاحب کہتے ہیں کہ پاکستان میں سلام کے جواب تین قسم کے دیئے جاتے ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جس میں جواب دینے والا جواب دینے کے بعد تابعدار کہتے ہوئے اپنا ہاتھ سینے پر دل کے مقام پر رکھتا ہے۔ یہ جواب دینے والا ایک مخلص شخص ہوسکتا ہے۔ اسی لیے اب اس جواب کے دینے والے یوں کمیابی کا شکار ہوگئے ہیں جیسے پاکستانی تیندوے۔ دوسری قسم وہ ہوتی ہے جس میں ہاتھ پیٹ کے قریب ترین رکھتے ہیں۔ جس کا مطلب پیٹ پاپی کے بندوبست کرنے کا اشارہ ہوتا ہے اور جب تک پیٹ پاپی کی آگ نہ بجھے بھلا کچھ اور نظر ہی کب آتا ہے۔ اس قسم کا جواب سیاست دان اور ایماندار سرکاری افسران دیتے ہیں اور بڑی گرمجوشی سے دیتے ہیں۔

تیسری قسم میں ہاتھ گردن کے پاس رکھا جاتا ہے۔ دراصل اس بندے کا مطلب ہوتا ہے کہ اگر موقع ملا تو صاحب سلام کی گردن مروڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑے گا۔ ایسا جواب پولیس کے جوان اور افسران بالا کو پہچاننے کا مخصوص نشان ہے۔ جہاں ایسے جواب دیتے کسی بندے کو دیکھا تو سمجھ جائے یہ پولیسیا ہے۔ خیر یہ بات تو برسبیل تذکرہ ہی سامنے آئی۔ بات ہو رہی تھی داڑھی رکھنے والے حضرات کی خوش خصالیوں کی۔ داڑھی رکھنے والے بیس فیصد حضرات تو واقعی بے ضرر اور اللہ لوک ہوتے ہیں جب کہ بقیہ اسی فیصد ان کا نام روشن کرنے کے لیے میدان میں کودتے ہیں بلکہ وہ اچھل کود کرتے ہیں کہ شرافت کا یہ میدان "ریشہ زار" بن جاتا ہے۔

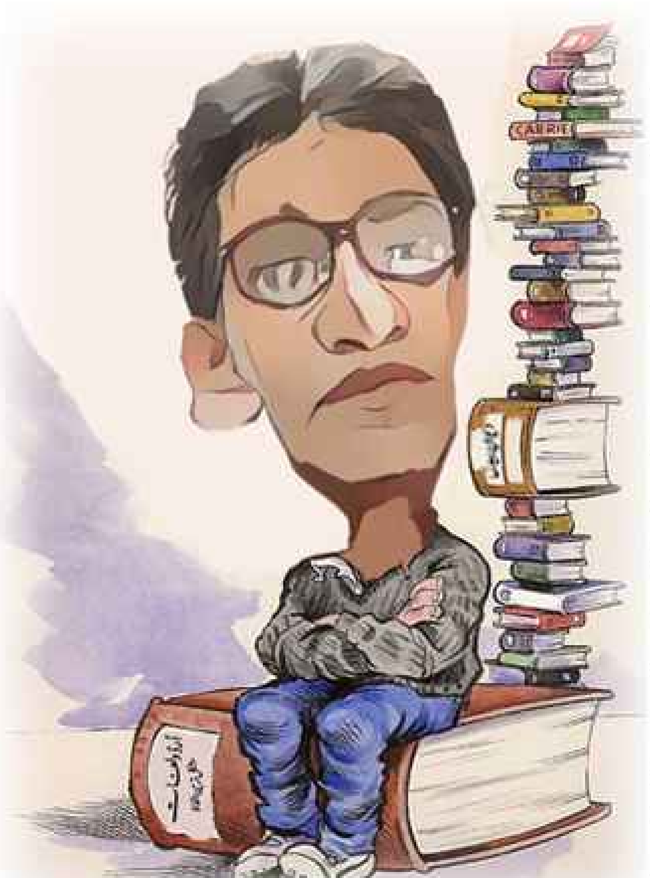
ٹھرک پنا مرد حضرات کی اُن بیماریوں میں سے ہے جو انھیں خود بھی بہت عزیز ہوتی ہیں۔ پاکستان میں اس بیماری کا شکار ہونے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اگر اس کی تعداد میں اسی طرح اضافہ ہوتا رہا تو جلد ہی اس کے باقاعدہ ادارے کھل جائیں گے جس میں محفوظ ٹھرک کی طرائق سکھائے جائیں گے۔

خیر بات ہو رہی تھی باریش حضرات کی تو ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ اس مقابلے کے دور میں یہ اس میں پیچھے رہ جائے۔ باریش حضرات کو تو داڑھی رکھ کر ٹھرک پنے کا گویا پرمٹ مل جاتا ہے۔ جہاں کہیں ٹھرک پنے کی دال گلتی دکھائی نہیں دیتی اور جوتے کا دیدار متوقع ہو فوراً ہی کچھ دیر قبل کے مست مال کا لقب پانی والی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹی کہہ دیتے ہیں اور "باپ" بن جاتے ہیں۔

ایک بار ایک ڈرائیور اپنے دوست کے سامنے اپنی حالتِ زار بیان کرتے اور پریشان پائے گئے دراصل اُنھیں دُکھ تھا کہ انھوں نے اپنی وین سکول کی ڈیوٹی کے لیے مخصوص کر دی مگر پھر بھی ان کی آنکھیں سینکنے کا بندوبست نہ ہوا، تب دوست نے داڑھی رکھنے کا مشورہ دیا جو خاطر خواہ اثر پذیر ہوا۔ چاچا جی بن کر اچھے بھی بنے رہے اور دل کے بچے بھی۔

خادم حسین مجاہدؔ

ضعیف قضا



اِن کے تعلقات صحت کے ساتھ بچپن سے ہی اس قدر خراب ہیں کہ ہر وقت قضا کا خطرہ رہتا ہے، اسی لیے اِن کو ضعیف قضا کہتے ہیں۔ اِنھوں نے میر دردؔ کی سی طبیعت پائی ہے، لہٰذا ہر وقت غمگین شکل بنائے رکھتے ہیں، چاہے اِس کے لیے کوئی خصوصی اہتمام کرنا پڑے حالانکہ خاصے خوش شکل ہیں، خوبیِ تقدیر سے کبھی خوش ہوں تو خطرہ رہتا ہے کہ نظر نہ لگ جائے۔ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں محض پینسٹھ دن کسی قدر صحت مند ہوتے ہیں حد تو یہ ہے کہ صحت کے ان خاص پینسٹھ دنوں میں بھی جب تک غمگین گانے سن سن کر خود کو بیمار نہ کر لیں چین سے نہیں بیٹھتے اور جو صحت کسی نہ کسی طرح بچ گئی ہے اس کو یوں ٹھکانے لگا رہے ہیں۔ انھی خطرناک علامات کی بنا پر محض شاعر ہی نہیں بلکہ مجسمِ شاعر ہیں۔ شاعری ان کے قلم اور منہ سے یوں ٹپکتی رہتی ہے جیسے عشاق کی آنکھوں سے آنسو۔۔۔ پھر شاعری بھی ایسی المناک کرتے ہیں کہ آدمی سن کر چیختا ہوا قبرستان پہنچ جائے۔ دراصل جوانی میں انھوں نے زور شور سے ایک محبت کی مگر جیسا کہ عموماً ہوتا ہے اس کی شادی کہیں اور ہوگئی اور ان کی کہیں اور۔۔۔ اس کے بعد ہی انھوں نے ایسی المناک شاعری شروع کی۔ اب بھی بیوی کو دوسری شادی کی تڑی اکثر لگاتے رہتے ہیں اور وہ ان کی صحت کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیتی ہے۔

ایک دن میں نے پوچھا کہ آپ کو دراصل روگ کیا ہے بولے ”کوئی ایک ہو تو بتاؤں!“ واقعی اکیلا عشق اِتنی تباہی نہیں پھیلا سکتا۔ اِتنے حساس ہیں کہ ؏

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہم ہیں امیرؔ

اپنے پرائے غم ان کو اٹھنے نہیں دیتے، شاید ان کی رقیق القلبی میں اس بات کو بھی کچھ دخل ہو کہ مسجد کے پڑوسی ہونے کی بنا پر علاقے میں ہونے والی اموات کے اعلانات عموماً ان کو ہی کرنا پڑتے ہیں جو یہ اس قدر دل سوزی سے کرتے ہیں کہ اس کے بعد ان کی اپنی حالت بھی میت کے لواحقین جیسی ہو جاتی ہے، بلکہ لگتا ہے کہ یہ سیلاب متاثرین میں سے ہیں۔

ہم نے عارضی بنیادوں پر ان کی بحالی صحت کے لیے تجویز پیش کی کہ اگر وہ چھ ماہ تک مکیش، عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، نصرت فتح علی خان اور منصور ملنگی کو نہ سنیں تو صحت میں کافی مثبت تبدیلیوں کی توقع کی جاسکتی ہے اور اگر وہ روزانہ اپنی دو غزلیں کسی معقول سامع کو سنانے میں کامیاب ہو جائیں تو سونے پہ سہاگہ ہے لیکن یہ تجویز دے کر خود ہم نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔ کیونکہ ہم سے زیادہ معقول سامع بھلا اور کون ہو سکتا تھا۔ اس تجویز کا سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ " آبیل مجھے مار"۔ خیر کچھ عرصہ تو ہم نے انسانی ہمدردی کی بنا پر برداشت کیا مگر جلد ہی ہمت جواب دے گئی۔ شاعری کے مزید حملوں سے دفاع کے لیے اوّل اوّل ہم نے یہ پیش بندی کی کہ ان کی شاعری کی پیروڈی کرنا شروع کر دی۔ یہ ردعمل بھی ان کے عمل کو کمزور نہیں کر سکا تو ہم نے کچھ نئے شاعروں، ادیبوں کو گھیر گھار کر ایک ادبی تنظیم قائم کر دی تاکہ ان کو سامعین کی دولت وافر مقدار میں مستقلاً حاصل رہے۔ اس حل سے جلد ہی ان کی حالت سنبھل گئی کیونکہ تنظیم کے اجلاسوں نے ان کے لیے وہ کام کیا جو ضعفِ جگر کے مریض کے لیے خون کی بوتلیں کرتی ہیں مگر پھر تنظیم کے اجلاس تعطل کا شکار ہو گئے تو ضعیف صاحب پھر سے روایتی شاعروں کے حلیے میں ملبوس ہو گئے۔

ایک دن ان سے ملاقات ہوئی تو خلافِ معمول موڈ اور صحت دونوں کافی بہتر لگ رہے تھے اور یہ بات بے بات چہک رہے تھے۔ ہم نے حیران ہو کے پوچھا ۔

بگولہ لے اڑا میری غزل میں مبتلا کاغذ
سو میرے آگے آگے بھاگتا ہے پر کشا کاغذ

مِن و تو ہی بھلا بیٹھے ترے بچے مرے بچے
پتنگوں میں اڑا ڈالا ترا کاغذ مرا کاغذ

خدا معلوم کس کے نام خط ہے، کس نے بھیجا ہے
لگا ہے ٹنڈ پر آ کر جو پتھر سے بھرا کاغذ

یہ کورا کورا کاغذ بھی کوئی مفہوم رکھتا ہے
نہ ہم نے کچھ لکھا اس پر، نہ اس نے کچھ پڑھا کاغذ

ذرا سی دیر کو بارش میں بھیگا تو کھلا مجھ پر
کہ میں جس کر تے میں تھا، اس کا کپڑا تھا نرا کاغذ

بھلا کس جیب کترے نے اڑا لی ہے غزل میری
ارے کھیسے میں ٹھونسا تھا ابھی اچھا بھلا کاغذ

ہماری بار کس کم بخت کو میرٹ کی سوجھی ہے
نہ تیرے نوٹ کام آئے نہ میرا چل سکا کاغذ

بہت سوں نے دیا ہے مشورہ " کھا پیا کر کچھ"
ہوا ہی لے اڑے ایسا بھی بن کر رہ نہ جا کاغذ

غزل کو سننے والے جائزہ لیتے ہیں رہ رہ کر
بڑا پرشور شاعر ہے، نہایت بے نوا کاغذ

یہی مجموعہ چھپوایا گیا تھا سونے کے بھاؤ
جو ردی والے کے ہاں ہے گرا کاغذ پڑا کاغذ

ظفرؔ اشعار میں لذت ہو نہ اسلوب میں جدت
تو پھر دیوان کا البرا ہے " کاغذ بٹا کاغذ"

نوید ظفر کیانی

مصحفی آج تیرے چہرے پہ کچھ بحالی ہے
کیا کوئی جواں درزن گھر میں ڈالی ہے

تو مسکراتے ہوئے بولے ”اپنی ایسی قسمت کہاں کہ اب تو بقول شاعر“۔

ایک بیوی ہے چار بچے ہیں
عشق جھوٹا ہے لوگ سچے ہیں

ہم نے چھیڑنے کے لیے کہا کہ اگر آپ سنجیدہ ہیں تو ہم آپ کی دوسری شادی کروا کے آپ کی دعائیں اور بھابھی کی بد دعائیں لینے کو بھی تیار ہیں تو بولے ”رہنے دو ایک شادی سے یہ حال ہے کہ واپڈا والے ٹرانسفارمر پر خطرہ ۴۴۰ وولٹ والے بورڈ پر ڈھانچے کی جگہ میری تصویر لگانے کی سوچ رہے ہیں تو ایسے میں دوسری شادی کا رسک کون لے۔“

ضعیف صاحب شاعری میں اُردو اِتنی آسان استعمال کرتے ہیں کہ گریجویٹس کے سر سے گزر جاتی ہے حالانکہ خود کالج کے مفرور ہیں اس کے باوجود شاعری میں ایسے ثقیل الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں جن کے معانی کا انھیں خود بھی پتا نہیں ہوتا اور شعر کا مطلب کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے نشان دہی بھی کی جائے تو یہ اسے بدلنے پر تیار نہیں ہوتے کیوں کہ یہ انھیں پسند ہوتا ہے مثلاً یہ شعر دیکھیے۔

اُف یہ تیرے حسن کی ریشہ دوانیاں
تاراج ہوگئی سلطنتِ دل یلغار سے پہلے

ہم نے اعتراض کیا ”اداؤں کو ریشہ دوانیاں کہنا تو حسن کی توہین ہے۔“ بولے ”ایک ہی بات ہے جب تمھارا پالا پڑے گا تو پتا چلے گا۔“

ایک بار انھیں کہا گیا کہ چھٹی جماعت کے بچوں کے لیے تقریر لکھ دیں۔ ایسی تقریر لکھی کہ اساتذہ بھی لغات لے کر بیٹھ گئے، ایسے ہی ایک صاحب نے اکبرالہ آبادی اور نظیر اکبرآبادی میں تمیز نہ کر سکنے کے باوجود اردو میں ایم اے تو کر لیا مگر ان کے اشعار کی تشریح نہ کر سکے۔ بدقسمتی سے یہ شاعری کی کتاب چھپوانے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں یہ الگ بات کہ جب وہ چھپے گی تو ہر کتاب کے ساتھ ایک عدد اردو لغت مفت میں دینا پڑے گی۔ ان کی شاعری کی بنا پر میرے خیال میں ان کی کتاب کا نام ”جنم جلا“، ”امنگوں کا جنازہ“، ”یادوں کی ارتھی“، یا پھر ”موت کا منتظر“ ہونا چاہیے مگر یہ اس ادبی وحشت گردی کو ”ریت کے شہر میں“ کا نام دینا چاہتے ہیں اور اکثر اس خطرناک ارادے کا اظہار کرتے رہتے ہیں اِتنا کچھ لکھنے کے باوجود اگر یہ اہل کتاب نہیں ہو سکے تو اس کی بڑی وجہ



اِن کی بیگم کا انتقامی رویہ ہے جو اب تک ان کی کئی بیاضیں کامیابی سے نذرِ آتش کر کے ٹھکانے لگا چکی ہے کیوں کہ وہ بجا طور پہ سمجھتی ہے کہ یہ بیاضیں انھوں نے سابق محبوبہ کی یاد میں شاعری کر کر کے بھری ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ضعیف صاحب کے دل و دماغ سے نہ تو اِن کی محبوبہ کو نکال سکی ہے نہ اس کی یاد میں کی جانے والی پر سوز شاعری کو، البتہ اس کی یہ مخلصانہ کوششیں اردو ادب پہ کسی احسان سے کم نہیں پھر بھی یہ خطرہ موجود ہے کہ کہیں ضعیف صاحب حافظے کے زور پر ہی ایک آدھ مجموعہ لانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو اس کے متاثرین میں سب سے بڑھ کے ہم ہی ہوں گے اس لیے ہمیں اپنی دعاؤں میں ہر وقت یاد رکھیں۔

یہ ڈاکو نہیں لیکن ہمیشہ مشاعرہ لوٹ کے آتے ہیں اسی لیے لوگ انھیں مشاعروں کی اطلاع نہیں دیتے مگر ان کے بے شمار شاگرد ہیں جن کے ذریعے اِن کو خبر ہو ہی جاتی ہے اور یہ دشمنوں کی چھاتی پہ مونگ دلنے پہنچ ہی جاتے ہیں۔

ہر شاعر ادیب کی طرح یہ بھی کتابیں اکٹھی کرنے کے بے حد شوقین ہیں بلکہ بک ڈپو بھی بنا رکھا ہے جبکہ مطالعہ کے سلسلے میں دھاک بٹھانے کے لیے پطرس بخاری کی دوست میل والا فارمولا استعمال کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر آپ ان سے کسی ایسی کتاب کا ذکر کر دیں جو ابھی شائع بھی نہ ہوئی ہو تو یہ اس کے پڑھنے کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر تفصیلی تبصرہ بھی کر دیں گے۔ ویسے اگر کوئی کتاب پڑھ لیں تو اس سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ جتنی توقع مصنف کو بھی نہیں ہوتی۔

ویسے تو عموماً شاعروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر پھر بھی ضعیف صاحب مذہبی آدمی ہیں اور ماشا اللہ صاحب ریش ہیں لیکن ان کی داڑھی اتنی مختصر ہے کہ بمشکل چالیس قدم والی شرط پوری کرتی ہے اور جس دن نائی سے ملاقات کر لیں وہ بھی نظر نہیں آتی۔

ویسے نہایت صلح جو آدمی ہیں اس لیے ہر ایک سے متفق ہو جاتے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ یہ تمام فرقوں کے اتحادی ہیں، اِس اتحاد کو اصطلاح میں کیا کہا جائے گا یہ میں علماء پر چھوڑتا ہوں ویسے چھوڑنا تو ان پر ملاؤں کو چاہیے۔

یہ عموماً بیوقوفوں کی طرح اپنی رائے پر ڈٹتے نہیں بلکہ سیانوں کی طرح بدل لیتے ہیں اس سے لوگ ان سے خوش رہتے ہیں اس لیے عوام میں مقبول ہیں اور الیکشن لڑیں تو آسانی سے جیت سکتے ہیں۔

ضعیف صاحب پیدائشی کرکٹر ہیں اور اپنے علاقے میں کرکٹ کی وبا پھیلانے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ یہ اب تک نونہالوں کی ایک بڑی تعداد کو کرکٹ میں جھونک چکے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ چونکہ اب خود یہ کرکٹ سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور چور چوری سے جاتا ہیں ہیرا پھیری سے نہیں جاتا اور دوسری وجہ یہ کہ انھیں اپنے سٹور پر سپورٹس کا سامان بھی بیچنا ہوتا ہے۔ مزید آج کل بچوں کے ٹورنامنٹ کرا کے اور ان کی کمنٹری کر کے اپنا ٹھرک پورا کرتے ہیں۔

آج کل ضعیف صاحب شاعری کے علاوہ بھی ہر موضوع پر بولتے ہوئے پائے جاتے ہیں خصوصاً سیاست اور عالمی حالات و واقعات ان کا من بھاتا اور عوام کے کان کھاتا موضوع ہیں اس پر یہ اتنا بولتے ہیں کہ عوام خود کو بے زبان سمجھنے لگ جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ اچھے کمپیئر بھی ہیں اور کمپیئر وہی تو ہوتا ہے جو سب سے زیادہ بولے اور جسے سب سنیں۔ ویسے تو ضعیف صاحب بہت اچھے اداکار بھی ہیں اور کئی مجمع بازوں فنکاروں، خطیبوں اور ذاکروں کی نقل اتنی خوبصورتی سے اتارتے ہیں کہ اصل سے بہتر کا گماں ہوتا ہے چونکہ کوئی چینل ان کے علاقے میں نہیں ہے اس لیے عوام اِن کے فن سے محروم ہیں۔ اللہ ان کو عوام خصوصاً سامعین کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین۔



وَلی دکنی

وہ محبت میں تری فانی ہوئے
روز و شب جو محوِ حیرانی ہوئے
دیکھ تجھ ابرو کی جوہر دار تیغ
جوہراں تلوار کے پانی ہوئے
تجھ نمین کے خنجراں پر کر نظر
دیدہ بازاں چشمِ قربانی ہوئے
اے سجن تیری پرت کے دوست کے
دوستاں کئی دشمنِ جانی ہوئے
جب سوں تو کھایا ہے پان اے آفتاب
تیرے لعلِ لب بدخشانی ہوئے
تجھ دہانِ کالعدم کی یاد سوں
بات میں عاشق کئی فانی ہوئے
تجھ ذقن کی دیکھ خوبی، گوہراں
غرق دریائے پشیمانی ہوئے
تجھ کو جو دیکھے یہاں اے صبح رو
جیوں سُرج دل اُن کے نورانی ہوئے
عشق میں اُس رشکِ لیلیٰ کے وَلی
مثلِ مجنوں کئی بیابانی ہوئے

نوید ظفر کیانی

بھوک سوں بے حال جو سانی ہوئے
روز و شب بھی محوِ حیرانی ہوئے
دیکھ "بجلیاں" کی سراپا ڈار تیغ
جوہراں تلوار کے پانی ہوئے
بِت نئے ٹیکساں کی ہیں نذر و نیاز
ہم غریباں مالِ قربانی ہوئے
نیوٹرل! تیری پرت کے میں نثار
صاحباں! تم دشمنِ جانی ہوئے
جب سوں تو کھایا ہے پان اے بے حجاب!
تیرے لب "ڈریکولائی ثانی" ہوئے
لیڈرانِ کالعدم کی یاد سوں
کچھ صحافی دِل سوں ہی فانی ہوئے
دیکھ "کرتوتانِ لیڈر"، اب شیطاں
غرق دریائے پشیمانی ہوئے
چھوٹی چھوٹی سرجری کے پرتاں سوں
جیوں سُرج مُکھ اُن کے نورانی ہوئے
گھر بنانا اب کہاں ممکن ظفرؔ
مثلِ مجنوں کئی بیابانی ہوئے

استاد قمرؔ جلالوی

یہ رستے میں کس سے ملاقات کر لی
کہاں رہ گئے تھے، بڑی رات کر لی

شبِ غم کبھی در کو اُٹھ اُٹھ کے دیکھا
کبھی ان کی تصویر سے بات کرلی

ہم اہلِ جنوں کا ٹھکانہ نہ پوچھو
کہیں دن نکالا کہیں رات کر لی

قمر اپنے گھر اُن کو مہماں بلا کر
بلا چاند کے چاندنی رات کر لی

کے ایچ مجاہدؔ

یہ رستے میں کس سے ملاقات کر لی
کہاں مر گئے تھے، بڑی رات کر لی

شبِ غم کبھی در کو اُٹھ اُٹھ کے دیکھا
کبھی اُن کی ہمشیر سے بات کر لی

ہم اہلِ سکوں کے مشاغل نہ پوچھو
کہیں بل نکالا کہیں لات کر لی

مجاہدؔ کے گھر اُن کے مہماں سلا کر
یہ سمجھو کہ کالی مری رات کر لی

کامیؔ شاہ

مرے جیسا نہیں لکھنا
اُسے تنہا نہیں لکھنا
جدائی توڑ نہ ڈالے
مجھے کچا نہیں لکھنا
خزاں نے پیڑ پہ لکھا
کوئی پتا نہیں لکھنا
اگر میرے نہیں ہو تم
مجھے میرا نہیں لکھنا
جدائی دھوپ ہے جاناں
تو کیا سایا نہیں لکھنا
محبت ایک موسم ہے
اسے لمحہ نہیں لکھنا

مسٹر توتی فرام نقار خانہ

مرے جیسا نہیں لکھنا
اُسے بندہ نہیں لکھنا
لگائی توڑ نہ ڈالے
مجھے کچا نہیں لکھنا
فلانے موڑ پر لکھ دو
یہاں نعرہ نہیں لکھنا
اگر بہرے نہیں ہو تم
مجھے اندھا نہیں لکھنا
جدا مخلوق ہے جاناں
"خلائی" سا نہیں لکھنا
محبت ایک جذبہ ہے
اِسے پنگا نہیں لکھنا

اسلم انصاری

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں
جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو، تو کوئی روکنے والا بھی نہیں
دور و نزدیک سے اُٹھتا نہیں شورِ زنجیر
اور صحرا میں کوئی نقشِ کفِ پا بھی نہیں
گل بہر رنگ، تبسم کا گنہگار رہا
زخمِ ہستی کا سوا اس کے مداوا بھی نہیں
کون سا موڑ ہے، کیوں پاؤں پکڑتی ہے زمیں
اُس کی بستی بھی نہیں، کوئی پکارا بھی نہیں
بے نیازی سے سبھی قریۂ جاں سے گزرے
دیکھتا کوئی نہیں ہے کہ تماشا بھی نہیں
وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں
اب تو اک رات ہے ہجراں کی دل وجاں پہ محیط
صبح کیسی، کہ ترے بعد اُجالا بھی نہیں
اک مسافر کہ جسے تیری طلب ہے کب سے
احتراماً تیرے کوچے سے گزرتا بھی نہیں
کس کو نیرنگیٔ ایام کی صورت دکھلائیں
رنگ اُڑتا بھی نہیں، نقش ٹھہرتا بھی نہیں
یا ہمیں کو نہ ملا اُس کی حقیقت کا سراغ
یا سرا پردۂ عالم میں کوئی تھا بھی نہیں

نوید ظفر کیانی

میں نے رَوکا بھی نہیں اور وہ بپھرا بھی نہیں
پنگا ہو جاتا تو کیا تھا نے پہنچتا بھی نہیں؟
زور وزر والوں سے کب پوچھ سکا ہے کوئی
وہ جو لندن کو گیا تھا ابھی لوٹا بھی نہیں
دور و نزدیک سے اُٹھتا نہیں شورِ دُر دُر
سگِ آوارہ بھی ایسا تھا کہ بھونکا بھی نہیں
وہ بہر رنگ کرپشن کا گنہگار رہا
اِس وطن میں تو سوا اِس کے مداوا بھی نہیں
"کارِ فطرت" پہ مرے پاؤں پٹختا ہے کوئی
یہ پلاٹ اُس کا نہیں، کوئی اجارہ بھی نہیں
دیکھنے ہم بھی بصد شوق اسمبلی کو گئے
کسی سرکس میں کوئی ایسا تماشا بھی نہیں
وہ جو چنگ چی پہ سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
ایسی حالت تھی کہ پہچان میں آیا بھی نہیں
اب تو اک ساس ہے، برسوں سے مرے گھر پہ محیط
میاں کیسا کہ مری تو کوئی سنتا بھی نہیں
ایک عاشق جسے پہنچا ہے رقیبوں نے بہت
یوں ڈرا ہے، ترے کوچے سے گزرتا بھی نہیں
کیسے نیرنگیٔ ایام کی صورت دکھلائیں
پاؤں تو اُس کا سرِ کیتی ٹھہرتا بھی نہیں
مل نہ پایا ہے اگر اُس کی کرپشن کا سراغ
فرض کر لیں کہ بدعنوان کوئی تھا بھی نہیں

پیروڈی اصطلاح میں وہ صنفِ ظرافت ہے جس میں کسی نظم یا نثر کی نقل اُتاری گئی ہو۔ خیالات کو بدل دیا گیا ہو جس سے مزاحیہ تاثرات پیدا ہو گئے ہوں۔ چکوراِن چاند کو دعوتِ عام ہے کہ وہ اپنی پیروڈیوں کو ای چاند کے اگلے شماروں کی زینت بنائیں۔

ڈاکٹر عارفہ صبح خان

داماد جی

داماد ہونا بھی بڑی بات ہے۔ بلکہ بعض کے لئے تو زندگی موت کا درجہ رکھتی ہے۔ آج کل لڑکیاں جتنی تیزی سے پڑھ کر انجینئر، وکیل، صحافی، سیاستدان، لیکچرار، پائلٹ اور کمانڈر یا پولیس آفیسر بن رہی ہیں۔ ان حالات میں عام لڑکوں کے لیے ایسی لڑکیوں کا حصول واقعی ناممکن ہوتا جارہا ہے۔ اب داماد بنا اتنا بھی آسان نہیں رہا مگر بہرحال جب اپنے جوڑ کا رشتہ نہ ملے تو لڑکیوں کو اسی لڑکے کے ساتھ شادی کے لیے ہاں کرنی پڑ جاتی ہے جسے ماں باپ نے دامادی کے لیے پسند کیا ہو۔

ویسے تو کئی ایسے لڑکے بھی داماد بن جاتے ہیں جنہیں والدین اپنے ملازم کے طور پر بھی پسند نہیں کرتے لیکن بیٹی "لومیرج" کر لیتی ہے اس لیے والدین کو سزا کے طور پر ایسے داماد بھگتنے پڑتے ہیں۔ داماد لمبا ہو یا ٹھگنا، گورا ہو یا کالا، غریب ہو یا امیر، شریف ہو یا بدمعاش، پتلا ہو یا موٹا، آفیسر ہو یا کلرک، پروفیسر ہو یا ٹیچر، چپڑاسی ہو یا جمعدار!! وہ ہر حال میں کہلاتا داماد ہی ہے۔



داماد کتنا ہی نکھٹو اور ناکارہ کیوں نہ ہو مگر اپنی تمام تر نالائقیوں کے باوجود اس کی اپنی ایک ویلیو ہے۔ خواہ اسے کوئی اپنے گھر میں منہ نہ لگائے مگر سسرال میں داماد کو گھاس ڈالی جاتی ہے۔ بہو کی نسبت داماد کے زیادہ ناز نخرے اٹھائے جاتے ہیں حالانکہ اکثر دامادوں کی ناز برداریوں کے بجائے اصولاً ان کی چھترول ہونی چاہیے بلکہ بعض دامادوں کو تو باقاعدہ خاص قسم کے ٹانک اور سیرپ دینے چاہئیں تاکہ ان کی اصلاح ہو سکے اور ان کے دماغ میں جو کیڑے رینگ رہے ہیں وہ زیادہ نہ کلبلائیں۔

اس دنیا میں کروڑوں داماد میں بعض داماد تو ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو بیک وقت دو مختلف گھروں میں داماد ہونے کا درجہ رکھتے ہیں۔ کچھ داماد ایسے بھی ہیں جن کے حصے میں تین، چار یا پانچ گھروں کی دامادی آتی ہے۔ ہر گھر میں ان کا مختلف انداز میں سواگت کیا جاتا ہے۔ کئی داماد ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں ایک ہی گھر میں دوبارہ داماد بننے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے اور

کبھی کبھی تو اسی گھر میں تین بار بھی داماد بن کر وہ ہیٹ ٹرک کر لیتے ہیں۔ ایسے دامادوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے کہ ایک بار سہرا باندھ کر اور دولہا بن کر داماد بنے۔ بیوی زچگی میں اللہ کو پیاری ہوگئی تو سالی حصے میں آگئی۔ پہلی بیوی کے چہلم پر جو دیگ زردے پلاؤ قورمے کی تیار ہوئی، انہی دیگوں پر سالی کے ساتھ نکاح پڑھوا لیا۔ چند سال خیر و عافیت سے گزرے اور کئی بچے ہوئے۔ بیوی کسی حادثے یا بیماری کی وجہ سے لقمۂ اجل ہوئی اور داماد جی ایک دفعہ پھر بیوی کی لاش سے لپٹ کر رونے لگے کہ ہائے میری دو بیویوں کے بچے کون پالے گا۔ ارے میں بچوں کی نئی ماں کہاں سے لاؤں گا۔ ایک شادی شدہ ادھیڑ عمر، چھ بچوں کے باپ کو کون اپنی بیٹی دے گا۔ ہائے! میں کسی نئی سسرال میں کیسے ایڈجسٹ کروں گا۔ میں نے ساری زندگی اپنی سسرال کو میکہ ہی سمجھا خدایا! میں کیا کروں، مجھے اتنے چاہنے والی سسرال اور بچوں کو ایسا ننھیال کہاں ملے گا۔ ہائے میں تو جیتے جی برباد ہوگیا!

داماد جی کی آہ و فغاں سن کر اور حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے سسرال والوں نے ہی بہتر جانا کہ داماد جی کو تیسری بار پھر اپنی فرزندی میں لے لیں چنانچہ داماد جی کے حصے میں دوسری سالی آگئی۔ نکاح ہوا، چھوہارے تقسیم ہوئے اور داماد جی نئی نویلی دلہن کے ساتھ سسرال کی چوکھٹ کے ہی ہو گئے۔

پاکستان میں بھی اس طرح کے کئی داماد پائے جاتے ہیں جنہیں ہیٹ ٹرک کرنے کا موقع اللہ نے دیا اور انہوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اب پہلی اور دوسری بیوی قصۂ پارینہ بن گئیں اور داماد جی ہنی مون پر چلے گئے۔ نئی نویلی دلہن کے انہوں نے جی بھر کے ارمان نکالے حالانکہ کہنا تو یہ چاہئے کہ اس بہانے انہوں نے اپنی باقی ماندہ تمام خواہشوں کی کسر نکالی۔

جس گھر میں داماد نہیں۔ اُس گھر میں سمجھیں کہ کوئی کام نہیں۔ جس گھر میں ایک داماد ہو، وہ اُسی قدر لاڈلا ہوگا لیکن جہاں دو ہوں، وہاں مقابلے کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ اگر تین چار یا پانچ ہوں تو مقابلے کی شرح میں اضافہ ہو جائے گا۔

عام طور پر ہر داماد کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ "منظور نظر" کہلائے۔ بعض اچھا بننے کی کوشش میں "اوور ایکٹنگ" کرنے لگتے ہیں۔ بعض تو اس قدر بھونڈی حرکتیں کرتے ہیں کہ سسرال والوں کو انہیں داماد بنانے کا زندگی بھر قلق رہتا ہے کہ کس کامیڈین کو داماد بنا لیا ہے۔

جس گھر میں ایک سے زائد داماد ہوں وہاں سرد جنگ جاری رہتی ہے۔ داماد سسرال والوں سے عموماً ڈائریکٹ ڈائیلنگ کم کرتے ہیں، البتہ بیوی کو کچوکے لگاتے رہتے ہیں کہ تمہاری ماں چھوٹے داماد کو زیادہ چاہتی ہے۔ تمہارا باپ بڑے داماد کو بڑا پروٹوکول دیتا ہے۔ تمہاری بہنیں بیچ والے داماد سے زیادہ مذاق کرتی ہیں۔ سسرال والے مجھے تو زیادہ منہ ہی نہیں لگاتے۔ تمہاری اپنی گھر میں عزت ہوتی تو سسرال والے میری بھی عزت کرتے۔ سب سے چھوٹی والی بہن کو دیکھو سب اس کے ساتھ لاڈ نخرے کرتے ہیں تو اس کے شوہر کے بھی ناز نخرے اٹھاتے ہیں۔ تمہاری بڑی بہن کی کتنی عزت ہے، اس لئے اس کے نکھٹو حرام شوہر کی بھی عزت ہے اور وہ جو تمہاری منجھلی بہن ہے، اس نے پورے گھر پر رعب رکھا ہوا ہے، اسی لیے پورا گھر اس کے شوہر کے سامنے ہاتھ جوڑے مئودب کھڑا رہتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے آگے دم مارے۔ ہونہہ! اور ایک تم ہو، تمہاری گھر میں کوئی حیثیت اور وقعت ہی نہیں۔ میری اتنی پرسنیلٹی ہے۔ اتنا بڑا خاندان ہے۔ تمہارے باقی بہنویوں سے زیادہ کماتا ہوں پھر بھی کوئی میری عزت نہیں کرتا۔ تمہاری ماں کو تو قسم ہے کہ کبھی اس نے میرا ماتھا چوما ہو یا مجھے دعائیں دی ہوں اور تمہارا باپ مجال ہے کبھی بھولے منہ میری تعریف کی ہو۔ تمہارا وہ نالائق آوارہ بھائی ہر وقت دوسرے بہنوئیوں کو پروٹوکول دیتا ہے۔ مجھے دیکھ لے گا تو فوراً اندھا، گونگا، بہرا بن جائے گا۔ مجھے تو وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں اور تمہاری بہنیں خدا کی پناہ انہیں تو مجھ سے اللہ واسطے کا بیر ہے مجھے

دیکھتے ہی فقرے کستی ہیں، ذو معنی جملے کہتی ہیں اور کھی کھی کر کے ہنستی ہیں اور بچے۔۔۔ وہ تو مجھے بڑا سمجھتے ہی نہیں بلکہ نوکر سمجھتے ہیں نوکر۔۔۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ یہ میری سگی سسرال نہیں، سوتیلی سسرال ہے۔ ارے کوئی اس طرح سلوک کرتا ہے اپنے داماد سے وہ بھی گھر داماد سے، لاحول ولاقوۃ۔

اکثر دامادوں کا سسرال پر تو بس نہیں چلتا لہٰذا وہ اپنی بیوی کو ہروقت تلتے رہتے ہیں تاکہ اس طرح سسرال والوں کی دُم پر پاؤں رکھ سکیں۔ بیوی کا ٹیشو دبا کر وہ سسرال والوں کے اعصاب پر چھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض داماد ایسے بھی ہوتے ہیں کہ سسرال والے اُن کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں اور وہ آگے آگے ہوتے ہیں۔ وہ سسرال والوں کے ہاتھ نہیں آتے اور عید، بقر عید کے موقع پر ہی سلام دعا کر کے رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ بعض داماد سسرال کی چوکھٹ پر ہی پڑے رہتے ہیں۔ اپنے داماد عرف عام میں گھر جوائی یا "چپکو داماد" کہلاتے ہیں۔ سسرال والے چپکو داماد سے جتنا پیچھا چھڑاتے ہیں، یہ اسی قدر اُن سے چپکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں "چیونگم داماد" بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے دامادوں سے نجات بڑی مشکل ہوتی ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ سسرال والے بھی انہیں پالیں پوسیں۔ اِن دامادوں نے دامادذات کی بڑی بے عزتی خراب کر رکھی ہے۔ گھر داماد کو کوئی پسند نہیں کرتا بلکہ معاشرے میں ہر آدمی نفرت اور حقارت سے دیکھتا ہے لیکن گھر داماد کے لیے "عزت" کوئی مسئلہ نہیں ہوتی، اُن کے لیے بے عزتی ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ گھر جوائی اگرچہ تعداد میں کم پائے جاتے ہیں مگر تعداد میں کم ہونے کے باوجود ان کی سرگرمیاں لامحدود ہوتی ہیں اور یہ سسرال پر قبضہ جمانے کے سارے گُر اپناتے ہیں۔ اِن کا مقولہ ہوتا ہے کہ سسرال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹو اور موج اڑاؤ۔ اکثر گھر داماد میٹھی چھری ثابت ہوتے ہیں اوپر سے بلا کے تابعدار، فرمانبردار، میٹھے اور بااخلاق ہوتے ہیں لیکن اندر سے نہایت شاطر، گھنے، دوغلے اور میسنے ہوتے ہیں۔ ان کا تکیہ کلام ہوتا ہے "ہاں جی۔۔۔ جی ہاں!"

بعض گھر داماد بالکل سیدھے ہوتے ہیں۔ وہ دفتر سے سیدھے گھر آتے ہیں اور گھر سے سیدھے دفتر جاتے ہیں۔ سسرال میں نہ ہر وقت پڑے رہتے ہیں اور نہ ہی سسرال والوں سے منہ موڑے رہتے ہیں۔ بیوی بچوں کے ساتھ ہفتہ میں ایک بار سسرال جاتے ہیں سب سے سلام دعا کرتے ہیں۔ نہ ساس کو آنکھیں دکھاتے ہیں، نہ ساس کے قدموں میں بیٹھتے ہیں۔ اس قسم کے داماد نہ سر کے آگے پیچھے پھرتے اور نہ سر کی دُرگت بناتے ہیں۔ نہ سالوں سالیوں سے مخول بازی کرتے ہیں۔ نہ خواہ مخواہ اکڑ دکھاتے ہیں۔ یہ ہر لحاظ سے مکمل اور خامیوں سے پاک داماد ہوتے ہیں۔ انہیں جو کچھ سسرال میں کھانے کو دال روٹی یا مرغ پلاؤ مل جائے خوشی اور سکون سے کھا لیتے ہیں۔ نہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، نہ منہ پھلاتے ہیں، نہ کھی کھی کر کے ہنستے ہیں اور نہ ہی آؤ بھگت پر مارے خوشی کے قلانچیں بھرتے ہیں۔ یہ بڑے معتدل مزاج ہوتے ہیں۔ ہر چیز اور ہر رشتے کو اس کی جگہ پر رکھتے ہیں۔ ان دامادوں کا موٹو ہوتا ہے جیو اور جینے دو، بندہ بن کر رہنے دو۔

یہ دنیا اگرچہ بھانت بھانت کے دامادوں سے بھری پڑی ہے۔ دنیا کا ہر داماد اپنی ذات میں انوکھا اور ڈھیٹ ہوتا ہے۔ آپ دامادوں کی کوئی بھی ورائٹی لے لیں اس میں ورائٹی پائیں گے۔

داماد ایک کیفیت کا نام بھی ہے۔ ہم نے بعض ایسے لونڈے اور مرد بھی دیکھتے ہیں کہ شادی سے پہلے بھلے چنگے تھے لیکن شادی ہوتے ہی خود کو افلاطون یا بیوروکریٹ افسر سمجھنے لگتے ہیں۔ بعض تو ہواؤں میں اُڑنے لگتے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب اس ٹائپ کے لوگ "دامادگیری" کے درجے پر فائز ہوتے ہیں تو خود کو اچانک خود کو کلرک سے آفیسر محسوس کرنے لگتے ہیں بعض کو تو کلف لگ جاتا ہے اور بعضوں کی گردن میں سریا آ جاتا ہے، خاص طور پر وہ مرد جن کی شادیاں "لیٹ میرج کیس" ہوتی ہیں۔ وہ خود کو

اچانک برتر، بہتر اور معتبر سمجھنے لگتے ہیں کیونکہ جب تک ان پر کنوارے کا لیبل لگا ہوا تھا تب تک ان کی کوئی ویلیو نہیں تھی۔ لڑکوں کی تو ہر دور میں ویلیو رہی ہے کیونکہ لڑکی والے لڑکوں کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن ایسے مرد جن کی شادی وقت پر نہ ہوئی ہو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ چالیس پچاس سال کی عمر کے مرد کو کنواری لڑکی نہیں ملتی۔ مرد ہو یا عورت، شادی کی عمر نکلنے پر دونوں کی ویلیو نہیں رہتی اور اوور ایج ہونے پر جیسا بھی رشتہ ملے، اُس پر صبر شکر کر کے گزارہ کرنا پڑتا ہے چنانچہ ایسے مرد، جن کی بہت تاخیر سے شادی ہوتی ہے جب انہیں داماد بننا نصیب ہوتا ہے تو اچانک اُن کی حرکتیں بھی نوجوان لڑکوں کی سی ہو جاتی ہیں۔ وہ تیز اور شوخ رنگ استعمال کرتے ہیں پاؤڈر اور پرفیوم کا بکثرت استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ سنگھار پٹی اور خضاب کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔ ان کے لہجے کی کرختگی مٹھاس میں بدل جاتی ہے۔ ایسے مردوں کے رویے میں اکثر میچورٹی اور گریس باقی نہیں رہتی۔ اس ٹائپ کے داماد فوراً اپنے مضحکہ خیز اور چھچھورے انداز سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات عجیب و غریب اور کبھی کبھار ایسی مضحکہ خیز ہوتی ہیں کہ بے ساختہ منہ سے نکل جاتا ہے "بوڑھا گھوڑا لال لگام!!"

داماد اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی لیکن نوجوان داماد کی نسبت عمر رسیدہ داماد زیادہ گھاگ ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوتا ہے۔ زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے نوجوان لڑکوں والا جذباتی پن نہیں ہوتا اس لیے بڑے طریقے سے سسرال والوں کو اشاروں پر نچاتے ہیں۔ بیوی کے سامنے شریف النفس بنے رہتے ہیں اور سسرال والوں کے سامنے بھی بظاہر بڑے معتبر بنے رہتے ہیں لیکن اندر خانے کاروائیاں ڈالتے رہتے ہیں۔ ان دامادوں پر ہاتھ ڈالنا سسرال والوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ زیادہ عمر اور تجربے کی وجہ سے یہ کسی کی گرفت میں نہیں آتے۔ بیوی اور سسرال والوں کو انہی کی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے۔

کچھ داماد جھگڑالو، منہ پھٹ اور بدتمیز یا سرکش بھی ہوتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو دامادوں کی اتنی اقسام ہیں کہ گنتے گنتے گنتی ختم ہو جائے گی لیکن دامادوں کی قسمیں ختم نہیں ہوں گی کیونکہ ہر داماد اپنی جگہ پر فنکار ہوتا ہے۔ اس کے فن کی داد نہ دینا سسرال والوں کے بدذوق ہونے کی نشانی ہے۔ داماد کو اپنے گھر والے اور سسرال والے ایک خاص فاصلے پر رکھتے ہوتے ہیں۔ اگر وہ دونوں خاندانوں کو صراطِ مستقیم پر نہ رکھے تو وہ خود خطِ منحنی بن کر رہ جائے۔

اکثر داماد اپنے گھر والوں اور بیوی کے گھر والوں کا موازنہ جیومیٹریکل طریقے سے کرتے رہتے ہیں۔ کبھی اُنہیں اپنے گھر والے خطِ استواء پر نظر آتے ہیں اور سسرال والے خطِ کشیدہ! اکثر داماد محض اس وجہ سے کبیدہ خاطر رہتے ہیں کہ انہیں بیوی تو اچھی مل گئی مگر سسرال والے اچھے نہیں ملے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سسرال والے تو بہت اعلیٰ، عمدہ، نفیس اور صلح جو ہوتے ہیں لیکن جو بیوی حصے میں آئی ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے انہیں داماد بننا نصیب ہوتا ہے، وہ اچھی نہیں ہوتی یا اچھی نہیں لگتی۔ ایک داماد بڑی حسرت سے کہہ رہا تھا کہ کاش! یہ سسرال تو مجھے اگلے جنم میں بھی ملے مگر بیوی یہ والی نہیں چلے گی۔ ایک دن یہی داماد اپنی سسرال میں بیٹھا یہی گلہ کر رہا تھا کہ آپ لوگ تو بہت اچھے ہیں لیکن کاش میری ہوئی بھی آپ لوگوں پر چلی جاتی۔

بیوی جل کر بولی کہ میں اپنی سسرال والوں پر چلی گئی ہوں۔ آپ کو تو اپنے گھر والوں کا عادی ہونا چاہئے۔

داماد ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "مگر شادی کے بعد تو مجھے سرال والوں کی عادت پڑ گئی ہے۔"

بیوی بھنا کر بولی "ظاہر ہے جب چوبیس گھنٹوں میں تم سولہ گھنٹے سرالیوں کے ساتھ رہو گے تو اُنہی کی عادت پڑے گی۔ خیر سے گھر جوائی ہو لیکن کوئی تو ہو جو تمہیں تمہارے گھر والوں کی یاد

دلاتا رہے۔"

بہر حال بہ بھی کیا کم ہے کہ انسان اشرف المخلوقات کہلائے اور "داماد" بنے بغیر دنیا سے گزر جائے جو مرد بھی کسی کے داماد نہیں بنے ان پر صرف "لاحول" پڑھا جا سکتا ہے یا "حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے" کا مصرعہ!

جو آدمی داماد نہیں بنا سمجھیں کہ اُس نے دنیا نہیں دیکھی۔ زندگی کے ہزاروں لاکھوں تجربے داماد بن کر ہی حاصل ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کنوارے کا جنازہ بھی جائز نہیں ہوتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ داماد بن کر ایک شخص جن امتحانوں سے گزرتا ہے اس کے بعد زمین اُسے فوراً اپنی آغوش میں لے لیتی ہے لیکن جو بندہ بھی داماد نہیں بنا سمجھو اس نے دردکا دریا عبور نہیں کیا اور نہ مشکلوں کے پہاڑ کاٹے، نہ غم کے صحرا سے گزرا۔ یہ بیچارہ داماد جی ہی ہوتا ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ ساتھ سسرال والوں کو بھی بھگتتا ہے۔ کچھ کو تو ایسی سسرال ملتی ہے کہ ان کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں بلکہ اگر وہ کچھ گناہ بونس میں کر لیں تو ان کی معافی بھی ہو جائے۔

ہم نے کئی ایسے داماد بھی دیکھے ہیں جن کی سسرال والے چھترول کرنا اپنا خاندانی پیشہ سمجھتے ہیں۔ داماد نے ذرا سر اٹھایا اور سسر سالوں نے مل کر داماد کا بھرتہ بنا دیا۔ بعض دفعہ تو اس کارِ خیر میں ساس اور سالیاں بھی برابر کی حصہ دار ہوتی ہیں۔ اس قسم کے ٹریجڈی سین میں رقت بیوی کی شمولیت سے پیدا ہوتی ہے جب بیوی بھی اپنے مجازی خدا کو کلموہا، نکھٹو، کام چور، بدحرام، زبان دراز، منحوس، غریب، فقیر کہہ کر دو ہتھڑ جماتی ہے اور ساتھ ہی باپ بھائیوں کے اشتعال کو اپنے جذباتی مکالموں سے ہوا دیتی ہے۔ ایسے داماد جی بیچارے نہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔

پاکستان میں ۱۵ فیصد ایسے بھی داماد پائے جاتے ہیں جن کی دامادی سسرال والوں کی ہٹ دھرمی، دھونس، دھمکی اور مکہ بازی سے قائم و دائم ہے۔ ایسے دامادوں پر بڑا ترس آتا ہے بلکہ بسا

۱۹۶۱ سے ۱۹۹۱ کے درمیان پیدا ہونے والی نسل کو جنریشن ایکس کی اصطلاح دی گئی ہے کہ انہوں نے دنیا کو سب سے زیادہ تیزی سے تبدیل ہوتے دیکھا ہے لیکن ہم اس نسل کو "بیچاری جنریشن" کہتے ہیں۔ ہم وہ جنریشن ہیں جو چھوٹے ہوتے تھے تب بڑوں کی مانی جاتی تھی۔ جب ہم خود والدین کے عہدے پر فائز ہوئے تو رواج بدل گیا۔ اب بچوں کی مانی جاتی ہے۔ ہماری کسی نے نہ مانی۔ (وحید اسلم)

اوقات آنکھوں سے سیلِ اشک بھی جاری ہو جاتا ہے لیکن جب دوسری قسم کے دامادوں پر نظر جاتی ہے تو ایک گونہ سکون محسوس ہوتا ہے۔

دوسری قسم کے داماد ولن ٹائپ کے ہوتے ہیں۔ یہ سسرال والوں کو یرغمال بنا کر رکھتے ہیں۔ ان کا اپنے سسرال والوں سے سلوک جنگ آمیز ہوتا ہے۔ داماد بن کر یہ خود کو کوئی توپ چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ دراصل اکثر مردوں کو پہلی بار داماد بننا نصیب ہوتا ہے اس لیے ان میں سے کچھ جامے میں پھولے نہیں سماتے اور کچھ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ دونوں قسم کے دامادوں کو ٹانک پلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ تو صرف تعویذوں سے ہی پٹڑی پر آ جاتے ہیں اس کے لیے جنوبی ایشیاء بالخصوص پاکستان اور بھارت کی بیویاں اور سسرال والے پیروں، فقیروں، عالموں، جوتشیوں، سنیاسوں بابوں سے رجوع کرتے ہیں تاکہ داماد کو قابو کیا جا سکے، تاہم دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض تعویذ ایسے کارگر ثابت ہوتے ہیں کہ داماد دام میں آ جاتا ہے اور ایسا مطیع ہو جاتا ہے کہ جہاں اس کی نکیل موڑ دو، مڑ جاتا ہے لیکن بعض دامادوں پر تعویذ دھاگے بھی اثر نہیں کرتے۔ انہیں ساس یا بیوی جتنے مرضی تعویذ گھول کر پلائیں، اثر الٹا ہی ہوتا ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ خونخوار اور زہریلے ہو جاتے ہیں۔ دراصل تعویذ دھاگے بھی ہر ایک پر اثر نہیں کرتے۔ اس کے لیے بھی طبیعت کی موزونیت ضروری ہے۔

بہر حال دامادوں کی ہزار ہا اقسام میں سے سات نادر اقسام درج ذیل ہیں۔ یہ خصوصیات یا عیوب کم و بیش سبھی دامادوں میں بدرجۂ

اُتم پائی جاتی ہیں۔ آزمائش شرط ہے لیکن صرف اپنے رسک پر۔ آیئے زرا نئے دامادوں سے ملئے مگر ذرا دھیان سے۔۔۔ ممکن ہے کوئی قسم خود آپ سے نہ ملتی ہو یعنی خود آپ ان میں سے ایک نہ ہوں۔

۱۔ گھرداماد

یہ دامادوں کی سب سے گھٹیا اور ناپسندیدہ قسم تصور کی جاتی ہے۔ گھر جوائی کی نہ گھر میں عزت ہوتی ہے نہ گھر سے باہر بلکہ گھر داماد کی مثال "گھر کا نہ گھاٹ کا" والی ہوتی ہے۔ گھر داماد میں عزت نفس، انا، غیرت کی خاصی کمی ہوتی ہے۔ جس طرح بعض لوگوں میں کیلشیم اور آئرن کی کمی ہوتی ہے، ٹھیک اُسی طرح گھر دامادوں میں حمیت اور انا کی کمی ہوتی ہے۔ عام طور پر گھر داماد وہی مرد بنتے ہیں جو اپنے گھر سے دھتکارے ہوئے ہوتے ہیں یا جنہیں اپنے گھر میں کوئی منہ نہیں لگاتا۔ اس کے علاوہ جو مرد ہڈ حرام، نکھٹو اور احساس کمتری یا پھر احساس محرومی کے مارے ہوئے ہوتے ہیں وہ بڑی آسانی سے گھر دامادی قبول کرلیتے ہیں۔ سسرال والے بھی انہیں دل سے پسند نہیں کرتے۔ گھر داماد بننے والے آرام طلب اور لالچی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سے بڑے گھر میں ہاتھ مارتے ہیں تاکہ ساری زندگی سسرال والوں کے ٹکڑوں پر پل سکیں۔ اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ یا تو سالوں کے گھر آباد نہ ہوں اور اگر آباد ہوں تو خدا کی مہربانی سے برباد ہوجائیں۔ جن عورتوں کی اپنے سسرال والوں سے نہیں بنتی یا جو خود بھی کام چور، زبان دراز اور پھوہڑ ہوتی ہیں، وہ بھی اپنے شوہروں کو اکسا کر گھر جوائی بنالیتی ہیں۔ انہیں لالچ دیتی ہیں۔ گھر داماد بننے کے لیے ڈھیٹ، بے شرم اور خود غرض ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ میں یہ کوالٹی نہیں ہے تو آپ اچھے گھر داماد نہیں بن سکتے۔ شروع دنوں میں گھر داماد بڑا مسکین، فرمانبردار، اطاعت گزار بن کر رہتا ہے۔ سسرال والے اس کے ساتھ چاہے نوکروں جیسا سلوک کریں یا جتنا مرضی اہانت آمیز رویہ اختیار کریں، وہ قطعاً برا نہیں مناتا بلکہ سسرال والوں کے اس انداز کو بھی سراہتا ہے کہ سسرال والے میری تربیت کررہے ہیں۔ گھر جوائی میں منافقت، ابن الوقتی اور چاپلوسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ یہ ہر وقت سسرال والوں کو الو بنانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ یہ سسرال والوں کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں اور ان کا برا بھلا سنتے ہیں۔ پہلے زمانے میں سسر اور سالے گھر جوائی سے شدید نفرت کرتے تھے لیکن بیوی اور ساس کی وجہ سے انہیں بھرپور سپورٹ مل جاتی تھی لیکن آج کل سسر، ساس، سالیوں اور بیوی سب کی آشیر باد حاصل ہوتی ہے، صرف سالے گھر جوائی کو ایک آنکھ برداشت نہیں کرتے لیکن دوسری آنکھ برداشت کرلیتے ہیں کیونکہ وہ ایسا نہ کریں تو بہنیں اپنے بھائیوں کے گھر بسنے نہ دیں۔ اپنی بہنوں کی لڑاکا فطرت، پھوہڑپن اور زبان درازی سے مجبور ہوکر انہیں یہ قربانی دینا پڑتی ہے کہ وہ اپنے بہنوئی کو "گھر جوائی" کی صورت میں برداشت کرتے ہیں۔ گھر جوائی شادی کے پہلے دس سال بھیگی بلی بن کر رہتے ہیں لیکن پھر ایسے کل پرزے نکالتے ہیں کہ سسرال والے پناہ مانگتے ہیں۔ وہ گھر پر، تمام مال واسباب پر، جائیداد پر قابض ہوجاتے ہیں۔ سالے، سسر اور ساس اپنے ہی گھر میں رہنے کے لئے گھر داماد کی منتیں، خوشامدیں کرتے پھرتے ہیں اور یہ بڑے اکڑے اکڑے پھرتے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار اختیار ملتے ہیں اس لئے خود کو کوئی توپ چیز سمجھتے ہیں۔

گھر جوائی غضب کے خوشامدی اور چاپلوس ہوتے ہیں۔ ان کا ہر جملہ "جی" سے شروع ہوکر "جی" پر ختم ہوتا ہے۔ اپنی خواہشمندانہ فطرت سے یہ بہت جلد اپنے سسرال والوں کے گوڈوں گٹوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ گھر جوائی خود غرض اور بے حس بھی ہوتے ہیں اور اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکتے ہیں۔ گھر جوائی کے سسرال میں ان

کے ماں باپ یا بہن بھائی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر وہ بیٹے کی محبت میں آ جائیں تو یہ سسرال والوں سے ان کی بے عزتی کرا لیتے ہیں بلکہ خود بھی اس مقابلۂ بے عزتی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ یہ دامادوں کی خطرناک قسم کہلاتی ہیں اور لوگ انہیں دامادوں کی سب سے گھٹیا اور بے شرم ترین قرار دیتے ہیں۔

۲- اکڑفوں داماد

یہ داماد ہر وقت اکڑے رہتے ہیں۔ داماد بننے کے بعد خود کو افلاطون سمجھنے لگتے ہیں۔ اِن کا رویہ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ یہ دنیا میں پہلی دفعہ داماد بنے ہوں یا انہیں کوئی بادشاہت مل گئی ہو۔ جب یہ بات کرتے ہیں تو اس قدر رعب اور جلال سے گویا بائیسویں بلکہ تیسویں گریڈ کے افسر ہوں۔ کوئی پیار کی بات بھی کریں تو ڈانٹ جیسی لگتی ہے۔ سسرال میں جائیں تو وی آئی پی پروٹوکول کے متمنی رہتے ہیں۔ اپنے سسرال والوں کو ہمیشہ یہی کہتے ہیں "اجی، آپ کی بیٹی کے لیے یہ کروایا ہے۔۔۔ آپ کی بیٹی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔۔۔ آپ کی بیٹی کو دس ہزار کی شاپنگ کروائی ہے۔"

اکڑفوں داماد کبھی یہ نہیں کہے گا کہ میں نے اپنی بیوی کے لیے یہ سارا کشٹ اُٹھایا ہے یا یہ کہ میری بیوی میری اتنی خدمت گزار ہے، اس لیے میں نے اس کے لیے یہ کام کیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے بچوں کے لیے کچھ کرے گا تو اس کا احسان بھی سسرال والوں کے سر پر ڈالے گا کہ "اجی، آپ کے نواسے کو سائیکل لے کر دی ہے۔۔۔ آپ کی نواسیوں کی فیس بھر کر آ رہا ہوں۔۔۔ آپ کے نواسوں کے سوٹ خریدے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

ہاں قسم کے داماد کے سر میں ہر وقت کیڑا اکلبلاتا رہتا ہے اور یہ ہر نئے دن میں لکڑی کی طرح سخت ہوتے جاتے ہیں۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ خود چاہے غریب ترین ہوں، تعلیم واجبی اور نوکری کلرکی والی ہو لیکن اکثر ایسے دکھاتے ہیں جیسے کہیں کے پرنس ہوں۔ اگر ان کا بس چلے تو یہ سسرال والوں کو تگنی کا ناچ نچا دیں۔ کسی کے ساتھ ہنستا بولنا حرام سمجھتے ہیں۔ بات کریں تو منہ سے پتھر جھڑتے ہیں۔ جب یہ سسرال سے اپنے گھر سدھار جائیں تو سسرال والے سکھ کا سانس لیتے ہیں۔ ان کا قول ہے "آفٹر آل میں داماد ہوں۔"

۳- چھچھورے، شیخی خورے داماد

یہ داماد بھی کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ یہ ہر معمولی بات کا سر کسی اہم واقعے سے جوڑ دیتے ہیں۔ اپنی بڑائیاں کرنا، گپیں ہانکنا ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔ اگر ملک سے باہر گئے ہوں تو چاہے باہر کتے نہلاتے یا گٹر صاف کرتے ہوں، خود کو افسرِ اعلیٰ بیان کریں گے۔ ہر بات ڈالروں، پونڈوں اور یورو یا ریالوں، دیناروں میں کریں گے۔ ایسی ایسی گپیں ماریں گے کہ الاماں!!

اپنی بیوی سے چونی اٹھنی کا بھی حساب لیں گے لیکن سسرال والوں کے سامنے ایسے شو کریں گے جیسے بیوی کو اشرفیوں میں تول رکھا ہے۔ گھر میں کھانے پینے کے معاملے میں بھی اعشاری اور اعدادی نظام جاری ہوگا لیکن ایسے ظاہر کریں گے جیسے گھر میں بکرے اور مرغے بھونے جاتے ہیں۔ بیوی کو کبھی بھولے سے سونے کا چھلہ یا لاکٹ بنوا کر دیں گے تو تشہیر سیٹ کی کریں گے۔ گھر ڈھائی مرلے کا بنائیں گے اور شو ایسے کریں گے جیسے ڈھائی کنال کا گھر بنایا ہے۔ اِن کی صبح کا آغاز خدا کے نام کے بجائے گپ سے ہوتا ہے اور رات کو سونے سے پہلے آیت الکرسی کے بجائے کوئی لطیفہ سنا کر سوتے ہیں۔ ہر وقت مذاق ٹھٹھول کرنا ان کی عادت ہے۔ یہ کبھی سنجیدہ نہیں ہوتے اور نہ سنجیدہ رہ سکتے ہیں۔ ان کے چھچھورپن کا یہ عالم ہوتا ہے کہ سسرال کا کوئی بزرگ بھی ان کے چھچھورپن سے محفوظ نہیں ہوتا۔ اُلٹے سیدھے مذاق، بیہودہ لطیفے اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے یہ خود کو منسوڑ، خوش مزاج، زندہ دل اور بذلہ سنج ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن اپنی ان حرکتوں کی وجہ سے اکثر تضحیک اِن کا مقدر بنتی ہے۔

۴۔ شکی اور وہمی داماد

یہ داماد ہمیشہ ڈرے سہمے رہتے ہیں۔ انھیں ہر وقت کوئی نہ کوئی وہم رہتا ہے۔ یہ اکثر مختلف قسم کے فوبیا میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ یہ سسرال والوں کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ اور زبان پر اوہام پرستی سوار رہتی ہے۔ یہ بیوی پر بھی شک کی نظر ڈالتے ہیں۔ انہیں وہم رہتا ہے کہ کہیں سسرال والے ان پر جادو ٹونا نہ کرادیں۔ کھانا بھی بار بار سونگھتے اور دیکھتے ہیں کہ کہیں اس میں کچھ ملا نہ دیا ہو ساس نے، کہیں بال، دال، گوشت، خون یا تعویذ نظر آ جائے تو انہیں پریشانی کے مارے ہفتوں نیند نہیں آتی۔

۵۔ غصیلے داماد

یہ داماد ہر وقت پھنکارتے رہتے ہیں۔ گالی گلوچ، ہاتھا پائی، مار کٹائی سب کچھ با آسانی کر لیتے ہیں۔ بات بات پر غصہ کھاتے ہیں تیوریوں پر بل پڑے رہتے ہیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ہر وقت اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ کوئی پھڈا ہو۔ اگر از خود پھڈے کا امکان نہ ہو تو یہ پھڈوں کا بندوبست کرتے ہیں۔ کوئی بات ہو، کہیں کی بات ہو، غصہ انہیں آتا ہے۔ غصے سے غضبناک اور لال پیلے ہو جاتے ہیں۔ اگلی پچھلی پشتوں کو ایسے ایسے خطابات سے نوازتے ہیں کہ پچھلے مر کر جی اٹھتے ہیں اور پھر شرم سے غرق قبر ہو جاتے ہیں۔ اگلی نسلیں آنے سے توبہ کرتی ہیں مگر انہیں آنا پڑتا ہے۔ یہ جب تک سسرال میں رہتے ہیں، سسرال والے تھر تھر کانپتے رہتے ہیں۔ بچے باپ کی شکل سے ڈرتے ہیں اور بیوی پیار کو بھی غصہ سمجھ کر پاس نہیں پھٹکتی۔

۶۔ چپکو یا چیونگم داماد

یہ دامادوں کی وہ نسل ہے جن سے اللہ بچائے۔ یہ داماد جن کے حصے میں آتے ہیں، انہیں ان سے نجات مرتے دم تک نصیب نہیں ہوتی۔ یہ اپنے گھر والوں کی طرف سے نظر انداز کردہ اور پیار کے بھوکے ہوتے ہیں جب سسرال سے عزت اور پیار ملتا ہے تو یہ ان سے چپک کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سسرال والوں سے ہر وقت چپکے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ دھتکار بھی دیں مگر یہ پھر ان کے در پر جا پڑتے ہیں۔ ان کی زندگی احساس کمتری اور محرومیوں سے بھری ہوتی ہے۔ شادی کے بعد یہ تمام توقعات سسرال والوں سے باندھ لیتے ہیں۔ ان کی مثال چیونگم کی طرح ہوتی کہ چیونگم کبھی ختم نہیں ہوتی اور جہاں لگاؤ چپک جاتی ہے اور جتنا ہٹاؤ، اتنی ہی چپکی رہتی ہے۔ یہ سسرال والوں کے "لے پالک داماد" ثابت ہوتے ہیں۔

۷۔ ہونہار، خوش مزاج داماد

یہ قسم کافی مشکل سے دستیاب ہوتی ہے۔ یہ داماد بڑے سلجھے ہوئے، ہونہار، غیور اور خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ یہ سسرال والوں کے منہ چڑھے ہوتے ہیں اور نہ انہیں سر چڑھاتے ہیں۔ یہ سب سے اچھے طریقے سے ملتے ہیں۔ ہر ایک کو اس کے مراتب کے مطابق ڈیل کرتے ہیں۔ ان کا ہر انداز باوقار ہوتا ہے۔ سسرال والوں کی عزت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور ان کے ہر دکھ سکھ کو شیئر کرتے ہیں۔ سسرال والوں کے آنے پر ناک بھوں چڑھانے کے بجائے خوش آمدید کہتے ہیں۔ نہ کسی کو زیادہ فری کرتے اور نہ کسی سے زیادہ فری ہوتے ہیں۔ زیادہ تر اپنی بیوی سے فری رہتے ہیں مگر فری سروس پر زیادہ یقین نہیں رکھتے۔ ان دامادوں سے سسرال والوں کا سر بلند ہوتا ہے۔ اس قسم کے دامادوں کے سسرال والوں سے ہمیشہ اچھے تعلقات رہتے ہیں۔ وہ مکھن لگانے یا لگوانے کو پسند نہیں کرتے۔ کوشش کرتے ہیں کہ مکھن صرف کھانے میں استعمال کریں۔ ان کی خوش مزاجی میں سارے حیاتین اپنا کام دکھاتے ہیں، اس لیے یہ جب مسکراتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ داماد ہو تو ایسا اور یہ کہ یہ داماد ہے کوئی "ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار" نہیں مگر ایسے داماد قسمت والوں کو ملتے ہیں۔

حافظ مظفر محسن



باجی شمع اور برفی کے دشمن

شمع باجی نے سب بچوں پر طائرانہ نظر ڈالی اور چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی (جیسے آنکھوں آنکھوں میں پوچھ رہی ہوں۔۔۔ سب تیار ہو ناں)۔

"آ گئے آ گئے۔۔۔ مہمان آ گئے۔۔۔" عدنان نے سعدی کے کان میں کہا۔

سعدی نے کھسر پھسر کے انداز میں لاپر کو بتایا "کھا گئے۔ کھا گئے۔۔۔ سب کچھ کھا گئے؟"

"کون؟" لاپر نے آہستہ سے پوچھا۔

"صاف ظاہر ہے چوہے ہی ہوں گے۔۔۔"

"اب کیا ہوگا۔۔۔" لاپر نے پھر پوچھا۔

"بندہ ایسے موقع پر تو کمینے بچوں والا کام نہ کرے۔۔۔" سعدی نے غصے میں کہا۔

السلام علیکم۔۔۔ السلام علیکم۔۔۔

"ہیں! یہ کیا؟" وہ تو اچانک آ دھمکے۔۔۔ "شمع باجی غصے میں بڑبڑائیں۔۔۔ (بچے ادھر ادھر دُبک گئے)

پھر سب بچے اپنی اپنی پوزیشن سے ہٹ گئے۔۔۔ ادھر اُدھر جا کے کھڑے ہو گئے۔۔۔ اس کا مطلب "جاسوسی کا نظام" فیل ہو گیا۔

"اب سب کی شامت آئے گی شمع باجی کے ہاتھوں۔۔۔" عدنان نے دل ہی دل میں سوچا۔ ڈرے ڈرے سہمے سہمے سب بچے ادب سے جائے نمازوں والی الماری کے پاس بیٹھ گئے۔۔۔ جیسے کسی کے منہ میں زبان نہ ہو، ہر طرف چپ کا دور دورہ تھا۔

سعدی شمع باجی کے حکم پر مہمانوں کے آگے سے گزرا اور نہایت بے شرم انسان کی طرح مہمانوں کے چہرے دیکھتا ہوا گزر گیا۔

"لڑکے کا بھائی تو بھینگا ہے۔۔۔" سعدی نے عدنان کے کان میں بتایا۔

"بھینگی خالہ کی طرح؟" عدنان نے حیرت سے پوری آنکھیں کھول کے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ نہیں۔۔۔ بھینگی خالہ تو تقریباً پندرہ فیصد تھیں یہ تو تقریباً ساٹھ فیصد بھینگا ہے۔۔۔"

"بھائی سنا ہے بھینگے بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں؟" سعدی نے پوچھا۔

"جبھی بھینگی خالہ کا چالیس ہزار والا پرائز بانڈ نکلا۔ مگر بانڈ چور لے گئے۔۔۔ اور خالہ کو محض نمبر یاد رہ گیا۔۔۔"

"لڑکے کا بھائی بھینگا ہے۔۔۔" عدنان نے لاپر کے کان

میں بتایا اور اس نے ارجو کے کان میں کھسر پھسر کی۔۔۔

''لڑکے کی بہن کا بیکار سا لہنگا ہے۔۔۔؟'' ارجو نے سینہ تانے بات باورچی خانے میں موجود شمع باجی کو جا کر بتائی اور واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ شمع باجی نے امی کو بتایا تو انہوں نے غصے سے شمع باجی کو ڈانٹ دیا۔۔۔ ''بیکار باتیں بتاتے ہیں تیرے یہ جاسوس۔۔۔ لڑکے کی بہن نے تو جینز پہن رکھی ہے۔۔۔ لہنگا کہاں سے آ گیا بیچ میں۔۔۔؟''

''ہائیں۔۔۔!!!'' شمع باجی کے منہ سے نکلا۔ (تقریباً تقریب وہ شرمندہ ہی ہو گئیں)

''تین سموسے۔۔۔'' ارجو نے مہمانوں کو کھاتے دیکھا اور چپکے سے آ کر جائے نمازوں والی الماری کے پاس بیٹھ کر لاپ کو بتایا۔ لاپہ نے سعدی کے کان میں کہا۔

''تین سموسے۔۔۔'' سعدی نے عدنان کے کان میں بولا۔۔۔ کھسر پھسر کے انداز میں۔۔۔ ''تینوں موٹے!''

عدنان بھاگ کے باورچی خانے میں گیا۔ شمع باجی وہاں تھیں۔۔۔ وہاں سے وہ سیدھا سنگھار میز کی طرف لپکا جہاں شمع باتی میک اپ کرنے میں محو تھیں۔

'' تینوں موٹے۔۔۔'' عدنان نے باجی کے کان میں کہا۔

تو باجی اچھلیں اور لپ اسٹک ہونٹ پر سلپ ہونے کی بجائے ناک میں جا گھسی۔

''شمع بیٹی تارہ کو لے کر آ جاؤ۔۔۔ مہمانوں کے پاس۔۔۔'' امی کی آواز سنائی دی۔

اُدھر ہونٹوں سے ناک تک اورنج کلر کی لپ اسٹک نے گند مچا رکھا تھا اِدھر تارہ کو لے کر مہمانوں کے سامنے جاتا تھا۔ ٹشو پیپر تلاش کیا۔۔۔ ''پتہ نہیں یہ کدھر گیا؟''

سب جو ڈیڑھ گھنٹے سے ہنسی ضبط کیے بیٹھے تھے، ایک ساتھ زور سے ہنسے۔

ارجو کی نئی چھیڑ ڈال دی شمع باجی نے۔۔۔ ''بندر!''

''بندرو! کرتی ہوں میں تمہاری ہنسی کا علاج۔۔۔'' شمع باجی آپے سے باہر ہو گئیں۔

اصل میں طے یہ پاتا تھا کہ شمع باجی چونکہ بازار سے ٹشو پیپر کا ڈبہ لانا بھول گئی تھیں، اس لیے چونکہ وقت کم تھا اور پورے گھر میں صرف ٹشو پیپر کا ایک ہی ڈبہ تھا۔۔۔ ارجو جب مہمانوں کی تواضع ہو جائے گی تو وہ ڈبہ اٹھا کر لے آئے گا اور میز پر رکھ دے گا تا کہ شمع باجی اور تارہ کے کام آئے۔۔۔ میک اپ کرتے ہوئے۔

رات ستمبر کے مہینے میں شمع باجی چونکہ پنکھا چلا کے سو گئیں تھیں اس لیے ٹھنڈ لگنے کے باعث ان کی ناک بہت زیادہ بہنے لگی تھی۔ انہوں نے چونکہ تارہ کو مہمانوں کے سامنے لے کر جانا تھا اس لیے ہونٹ (اوپر والے سے) سے ناک تک ایک تو لپ اسٹک بکھر گئی اوپر سے ناک بہہ نکلی۔۔۔ یہ منظر بالکل دیکھنے کے لائق نہ تھا۔۔۔ وقت تھوڑا، مقابلہ سخت تھا اس لیے شمع باجی نے بکھری لپ اسٹک، بہتی ناک ہونٹوں کا پھیلاؤ کنٹرول کرنے کے لیے اپنے گرتے دوپٹے کے پلو سے سب کو ایک ساتھ صاف کرنے کے چکر میں جو پھیرا تو یہ سب مکسچر شمع باجی کی پھیلی ٹھوڑی پر بکھر گیا۔ تارہ خود ہی باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔۔۔ ''چلو شمع باجی۔۔۔؟''

گھبرانا تارہ کو تھا مگر یہاں شمع باجی نروس ہو گئی۔۔۔ یہ موقع ایسا ہوتا ہے جہاں بڑے بڑوں کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے)

ایک دم سے شمع باجی کی نظر تارہ کے کھلے دانتوں پر پڑی۔۔۔ ''تو نے پودینہ چٹنی کے ساتھ کیا کھایا ہے؟'' وہ غصے سے بولیں۔

''آدھا سموسہ پڑا تھا۔۔۔ میں نے سوچا بچ ہو سکتا ہے مہمانوں کے جانے کے بعد چٹ کر جائیں۔۔۔ میں پودینہ چٹنی میں ڈبو کر چٹ کر گئی۔ مگر آپ نے کیسے اندازہ لگایا وہ تو اب تک میرے معدے میں بھی اتر چکا ہے۔۔۔؟'' تارہ نے حیرت سے وضاحت کرتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے دانتوں میں پودینہ چٹنی جو پھنسی رہ گئی، چل تُلّی کرلے جلدی سے۔۔۔امتحان کا وقت ہو چکا ہے۔۔۔!''

''امتحان کا وقت۔۔۔؟''سب بچوں کا ایک ساتھ قہقہہ بلند ہوا۔

اِس دوران شمع باجی تارہ کو لے کر مہمانوں کے سامنے پیش ہو چکی تھیں۔لڑکے کی بہن نے جو تارہ کو دیکھا تو ایک دم سے اٹھی (ہنستے ہوئے)''چرّ'' کی آواز آئی۔ہمسایوں کے گھر سے جو کرسی منگوائی تھی اس میں سے نکلی کیل لگنے سے بیچاری کا دوپٹہ آدھے سے زیادہ پھٹ گیا۔

امی خالدہ بھابھی سے دوپٹہ ادھار لے کر آئی تھی۔۔۔اُن کو جا کر کیا جواب دوں گی۔۔۔؟''لڑکے کی بہن نے روتے ہوئے کہا۔

وہ بھول گئی کہ وہ تو بھائی کے رشتہ کے لیے لڑکی دیکھنے آئی ہوئی ہے)۔اس دوران لڑکی کی امی تارہ سے بغل گیر ہو چکی تھیں۔

''یہ تو گھر کی بیٹی نکل آئی۔ہاں امی۔۔۔!''روتی ہوئی لڑکی نے اپنا رونا ضبط کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ تو دونوں تارہ اور لڑکے کی بہن کلاس فیلو نکل آئیں اور رشتہ طے پا گیا ورنہ تم نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی رشتہ گنوانے اور ہمیں ذلیل کروانے میں۔۔۔!!''شمع باجی نے قطار میں لگے بہن بھائیوں پر چھڑی ہاتھ میں پکڑے رعب ڈالتے ہوئے کہا۔

''رہی بات جاسوسی کی تو اس میں بھی تم سب زیرو ہو۔۔۔ صفر ہے کارکردگی تم سب کی۔۔۔عدنان نے مہمانوں کی آمد کی اطلاع دینا تھی مگر اس نے ڈرتے ڈرتے پیغام دیا جو الٹ سمجھ لیا گیا۔آ گئے گئے۔۔۔''آ گئے'' کو'' کھا گئے''۔۔۔کھا گئے سمجھ لیا گیا۔

ارجو نے بتانا چاہا کہ لڑکے کی امی یعنی خالہ جان نے ایک دم سے پلیٹ میں اکٹھے تین سموسے ڈال لیے ہیں جبکہ پیغام ''تین سموسے'' کی بجائے ''تینوں موٹے'' بن کر پیش کر دیا گیا۔

''سب سے بری بات کہ صبر کا دامن پھر سب نے چھوڑ دیا۔ جب مہمانوں کے سامنے برفی کی پلیٹ پر سے رُومال اٹھایا گیا تو سب سے بڑی پلیٹ میں صرف ایک ڈلی برفی کی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔۔۔اور۔۔۔''

''اور وہ بھی مہمانوں کی بجائے شمع باجی، آپ نے منہ میں ڈال لی۔۔۔''ارجو نے سنجیدگی سے کہا۔اور سب، زور زور سے ہنسنے لگے۔

ماہیے شاہیے

امی نے اُسے ڈانٹا
مانگی جو نئی امی
منے کو پڑا چانٹا

پہلے تو سگائی تھی
بلی کو ملا بِلا
بارات بھی آئی تھی

کیوں شور مچاتے ہو؟
کانوں کے پھٹے پردے
کیا راگ سناتے ہو

منا لال چقندر ہے
لاحولَ وَ لا قوۃ
انساں ہے یا بندر ہے

تنویر پھول



گوشت کٹے دا

بابا شوقی، دھمال نگر



میں اپنی دکان پہ شہر سے آئے کزن کے ساتھ گپ شپ میں مشغول تھا کہ اچانک میرے قریبی قصاب نے ہانک لگائی۔ ''گوشت کٹے دا'' ہمارے لیے یہ معمول کی بات تھی مگر میرا کزن چونک کر بولا۔'' بڑا دیدہ دلیر اور بدمعاش قسائی ہے جو سرِعام اور علانیہ کتے کا گوشت بیچ رہا ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں''۔ اس کی بات سن کر میرا ہنس ہنس کے برا حال ہوگیا اور جب ہنسی کچھ تھمی تو میں نے اسے بتایا کہ وہ ''کتے'' کا نہیں بلکہ ''کٹے'' یعنی بھینس کے بچے کا گوشت بیچ رہا ہے۔

اگلا مقرر

نوید ظفر کیانی، اسلام آباد

غالباً ۱۹۸۱ء کا تذکرہ ہے جب آتش جوان تھا۔ اُنہی دنوں ہمارے ایک یارِ غار اور صاحب طرز شاعر جناب ساجد کلیم ساجد نے ''بزمِ انقلابِ ادب'' کی بنیاد رکھی تھی جس کے تحت پہلی تقریب بچوں کے مابین تقریری مقابلے کا انعقاد تھا۔ عنوان تھا ''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے''۔ تقریب کے صدر جناب نسیم حجازی تھے جو علالت کے باعث تشریف نہیں لاسکے تھے چنانچہ صدارت کے فرائض جناب پروفیسر مقصود جعفری کے ذمے لگائے گئے، جو نہ صرف خوش بیان شاعر تھے بلکہ ایک اچھے پُرجوش مقرر بھی تھے۔ دیگر مقررین میں جناب انور مسعود، جناب احسان اکبر، جناب جناب ماجد صدیقی، جناب شاہد محمود اور دیگر معروف مقررین شامل تھے۔ سب سے پہلے ماجد صدیقی



صاحب نے اظہارِ خیال کیا۔ اس کے بعد جناب احسان اکبر صاحب کو بلایا گیا جنہوں نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ "صاحب، اب میں کیا بولوں، مجھ سے پہلے ہی ماجد صدیقی صاحب نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا ہے جو میں نے کہنا تھا۔ جناب انور مسعود اگلی صف میں تشریف فرما تھے۔ دوسرے ہی لمحے اُن کی چہچہاتی ہوئی آواز آئی "اگر ماجد صدیقی صاحب نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا ہے جو آپ نے کہنا تھا تو آپ وہ سب کچھ کہہ ڈالئے جو اگلے مقرر نے کہنا ہے۔"

اُن کے اِس برجستہ مکالمے پر تمام محفل کشت زعفران بن گئی۔

راستے کا گڑھا

روبینہ شاہین بیناؔ، راولپنڈی

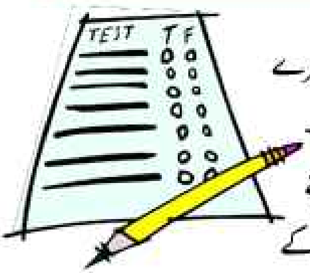


میں اپنے بیٹے "ہنی" کو صبح سکول چھوڑنے جا رہی تھی، جو اُس وقت نرسری میں پڑھتا تھا۔ اُس کا سکول دو گلیوں کے فاصلے پر واقع ہے۔ گلی کے نکڑ پر پہنچے تو کیا دیکھا کہ مزدور گلی کے بیچوں بیچ گڑھا کھودنے میں مصروف تھے، گڑھا غالباً ٹیلیفون کیبل بچھانے کے لئے کھودا جا رہا تھا اس لئے زیادہ چوڑا نہیں تھا، اُس پر سے با آسانی گزرا جا سکتا تھا۔ میں تو آرام سے پار کر گئی لیکن ہنی میاں کے لئے وہ گڑھا پل صراط ثابت ہوا، چھلانگ لگا کر وہ اُسے پار تو کر گئے لیکن اپنے آپ کو ہتھیلیوں کے بل زمین پر ٹیک لگا کر گرنے سے بچایا۔ ہاتھ جھاڑتے ہوئے انہوں نے مڑ کر قریب کھڑے ہوئے مزدور کی جانب دیکھا جو مسکراتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ہنی میاں تن فن کر بولے "یاد رکھیں انکل! جو دوسروں کے لئے گڑھا کھودتا ہے وہ خود اُس میں گرتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ فاتحانہ انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر چل دیے، جبکہ مزدوروں کے قہقہے کافی دور تک ہمارا تعاقب کرتے رہے۔

پرچے

خادم حسین مجاہد، بھابھڑا، سرگودھا



یہ اُن دنوں کی بات ہے جب "چاند" اور "اخبارِ جہاں" میں ادب، سیاست اور کئی اور موضوعات پر میرے مزاحیہ پرچے چھپے۔ ایک دن میں دکان پہ بیٹھا تھا کہ ایک بوڑھا پوچھتا پچھاتا میرے پاس پہنچا۔ نام کی تصدیق کے بعد اس نے بتایا کہ اس کا تعلق ایک قریبی گاؤں سے ہے اور وہ شہر میں اپنے چودھریوں کے لڑکوں کے ساتھ بطور ملازم رہتا ہے جو کالج میں پڑھتے ہیں۔ انھوں نے آپ کے

پرچے پڑھے ہیں جوان سے حل نہیں ہوئے اس لیے انھوں نے وہ حل کرانے کے لیے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس کی بات سن کر میں بہت ہنسا اور سمجھا بجھا کر رخصت کیا کہ ان پرچوں میں ہی ان کا حل بھی ہے، آپ اُن لڑکوں کو میرے پاس بھیجنا میں سمجھا دوں گا۔ کالج کے لڑکے اگر واقعی ان پرچوں کو نہیں سمجھے تھے تو یہ مقامِ حیرت تھا اور اگر انھوں نے مذاق کیا تھا تو اس پر داد بنتی تھی۔

بھلکڑ

آخری درویش



ہمارے ایک دوست کو بھول جانے کی عادت ہے۔ ایک دفعہ یہ بائیک پہ کالج گئے اور پیدل گھر واپس آ گئے۔ اسی طرح ایک بار کھیلنے کے لیے بائیک پر گراؤنڈ میں گئے اور واپس پیدل گھر آ گئے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں اکثر صبح شلوار اُلٹی پہن کر ناشتہ لینے بازار آ جاتے ہیں اصل تماشہ تو اس دن بنا جب وہ بیگم کی شلوار پہن کے آ گئے اور سارا بازار ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

اندھا

عامر عباس ناصر اعوان، اوکاڑہ



گئے سالوں کا تذکرہ ہے، میں اور میرے ایک بزرگ کولیگ جنھیں میں انکل کہتا ہوں، اعوانوں کے جد حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ کے دربار عالی وقار پر سلام و زیارت حاضری کے گئے وہاں جوتے اُتارتے ہوئے میں نے انکل عبدالغفور صاحب کو کہا کہ یہاں جوتے اُتاردوں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟ کوئی جوتے غائب تو نہیں کر دے گا؟؟

بولے "کوئی اندھا ہی ہوگا۔"

خیر، واپسی پر جوتوں کی جگہ پہنچے۔ میرے جوتے تو جوں کے توں موجود تھے لیکن انکل جانی کے جوتے غائب تھے۔

میں نے کہا "انکل میں نے اُس وقت یہی تو گزارش کی تھی۔"

انکل جانی پروقار انداز میں بولے "یار! اندھا ہی تھا جو میرے جوتے اُٹھا کے لے گیا۔"

اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے دوسرے جوتے پہنے اور واپس چل دیے۔

سہولت

مس عاتکہ کشش، لاہور

حالیہ بارشوں میں بازار سے گزر ہوا تو دیکھا کہ ایک جگہ بہت سا پانی کھڑا ہے اور لوگوں نے اس میں ایک اونچا سٹول رکھ کر اس پر کپڑے



دھونے کا صابن اور ایک پرانا تولیہ رکھا ہوا تھا اور ساتھ ہی گتے پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر تھی۔

"ٹھہریے! آپ نہر پر جا رہے ہیں۔ اس جھیل میں نہائیے۔ صابن تولیہ مفت۔" منجانب: منیر کارپوریشن۔

یہ پڑھ کر ایک میں ہی کیا، سبھی لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

اچھی بات

مس ناطقہ کشش۔ لاہور



ہماری ایک دور پار کی رشتے دار اپنے میاں کا خط پڑھوانے آئیں۔ ان کا میاں شہر مزدوری کرتا تھا۔ میں نے خط ان کو سنا دیا تو لفافہ مجھے دیتی ہوئی بولیں کہ یہ اوپر سرخ رنگ میں کیا چھپا ہوا ہے یہ بھی پڑھ کے سنائیں یقیناً کوئی اچھی بات ہی ہوگی۔

میں نے کہا "اماں! ہے تو اچھی بات مگر لوگ عمل نہیں کرتے۔"

بولیں "پتا تو چلے کیا اچھی بات ہے جس پہ لوگ عمل نہیں کرتے۔"

"اماں یہ لکھا ہے، چھوٹا خاندان زندگی آسان۔"

اماں نے یہ سن کر مجھے گھور کے دیکھا کیوں کہ ان کے نو بچے ہیں۔ مجبوراً مجھے قہقہہ حلق میں ہی قتل کرنا پڑا۔

کنوارا

مسترتوتی فرام نقارخانہ



خواجہ طارق مشاعرے میں یہ غزل پڑھ رہے تھے ع

دل گیا اور درد تھارا رہ گیا

جب انھوں نے یہ مصرع پڑھا ع

اک پڑوسن کی جو شادی ہوگئی

تو کے ایچ مجاہد نے فوراً ہانک لگائی ع

اور خواجہ پھر کنوارا رہ گیا

تو محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

نوے روزہ ای چاند کے دوستوں کے ساتھ اپنے خوشگوار لمحوں کا اشتراک کیجیے، ہنس بیتیاں کا یہ گوشہ آپ کا منتظر ہے۔

رکشہ

جواد حسن جواد

دنیا یہ طلسمات کی یہ رنگِ زمانہ
محنت کا ثمر کوششِ پیہم کا فسانہ
لیکن بڑا دلچسپ ہے رکشے کو بتانا
ایجاد کا قانون ہے پر کی اڑانا

کشتی کی طرح اس کا بھی سسٹم ہے سہانا
چلنے کے لئے پڑتا ہے چپو سا اٹھانا
آہنگ میں اس کے ہے کوئی "جنگی ترانہ"
یا بھینس کی آواز میں مینڈک کا فسانہ

گزرے جو کبھی پاس سے بھیجا یہ ہلا دے
سنگیت بنا گیت کا نقصان بتا دے
برسات میں ہر شخص کو یوں اپنا پتا دے
چھینٹے وہ اڑائے کہ نئے نقش بنا دے

ناراض نہ ہوں آپ جو ٹکر بھی لگا دے
اچھا نہیں لگتا اسے پیں پیں کی صدا دے
بہتر ہے نہ گزریں جو گزرنے کی بھی جا دے
ایسا نہ ہو دنیا کے بکھیڑوں سے چھڑا دے

تحریر ہیں رکشے پہ جو اشعار یہ پڑھ لیں
ڈھونڈیں نہ ادب کے نئے شہکار یہ پڑھ لیں
حاضر نہیں کچھ اور تو ناچار یہ پڑھ لیں
رہنے دیں خریدیں نہیں اخبار یہ پڑھ لیں

بیٹھیں ذرا ہشیار و خبردار یہ پڑھ لیں
سنتے ہوئے خواہ گیت کی جھنکار یہ پڑھ لیں
رکشے کا سفر ہے ذرا دشوار یہ پڑھ لیں
"کلمہ" جبھی لکھا ہے کہ سرکار یہ پڑھ لیں



ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

شعبۂ ہڈی جوڑ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کی متوقع کتاب "ہسپتالیات" کا ایک باب



جسم کے مختلف حصوں پہ اپنی انگلی رکھ رکھ کر ایک مریض ڈاکٹر صاحب کو اپنے درد کی پیتا سنا رہا تھا، "ڈاکٹر صاحب! مجھے یہاں درد ہے" اس نے کمر پہ ہاتھ رکھا۔ "اور یہاں بھی درد ہے" اس دفعہ اس کی انگلی بازو پر تھی۔

اور پھر یہ انگلی جسم کے مختلف حصوں کی سیر و سیاحت کرتی ہوئی مریض کی تھوڑی پر پہنچی کہ "ڈاکٹر صاحب جب میں زور سے دباؤں تو یہاں بھی درد ہوتا ہے"۔

ڈاکٹر صاحب کچھ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آخر قصہ کیا ہے۔ اُنہوں نے ہر جگہ کے ایکس رے کرا ڈالے مگر درد کا راز نہ کھلا اور بالآخر ایک آرتھوپیڈک سرجن نے راز افشاء کیا کہ درد دراصل مریض کی فریکچر زدہ انگلی سے اٹھ رہا تھا جسے وہ ہر جگہ دبا رہا تھا۔

یہ واقعہ پڑھ کر ہماری نظر میں آرتھوپیڈک سرجن کی قدر و قیمت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی اور ہم نے سوچا کہ کیوں نہ یہ مضمون ان ہی کے نام کر دیا جائے۔

اِستخوانی غزل

اُستخواں ہیں بدن میں ہر جانب
گوشِ خانہ خراب میں ہڈی
ہیں گرانی میں چھیچھڑے نایاب
اب نظر آئے خواب میں ہڈی
بولا سرجن اِک آرتھوپیڈک
کانٹا کیا ہے گلاب میں ہڈی
مُرغ سالم ڈکار لے واعظ
اور میرے ثواب میں ہڈی
نرس کے ساتھ اُس کے ابا جی
یوں ہیں جیسے کباب میں ہڈی
کام ہو جائیں گے ترے فوراً
پھینک اُن کی جناب میں ہڈی
جب کریں ہم سوال بوٹی کا
دیتے ہیں وہ جواب میں ہڈی
شعر پڑھتے رہے میاں مظہر
رہ گئی اُن کی قتاب میں ہڈی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ہڈی اور جوڑوں کے امراض کے بھی دو طرح کے معالج ہوتے ہیں ایک وہ جو صرف دوائی سے علاج کرتے ہیں اور

رھیمٹالوجسٹ کے نام سے موسوم ہیں جب کہ دوسرے ڈاکسٹر صاحب یہ علاج بذریعہ جراحی کرتے ہیں۔لطف کی بات یہ ہے کہ اولذکر شعبہ کافی نیا ہے لہذا اس شعبے کے مریض بھی سرجن صاحب (جن کو بڑا سرجن بھی سمجھا جاتا ہے) کے زیر علاج رہتے ہیں اور سرجن سے "رہیومٹالوجسٹ" کا علاج کراتے ہوئے دوائیاں پھانکتے رہتے ہیں۔

ہڈیوں کی ساخت

کیلشیم فاسفورس میگنیشیم وغیرہ پر مبنی جسم کا یہ سخت ترین عضو انسان کا ساتھ سب سے آخر میں چھوڑتا ہے۔قدیم انسانوں کی



ہڈیاں آج بھی ہمیں پرانی تہذیب سے روشناس کراتی ہیں مگر بقول انور مسعود ـ

عبرت کی اک چھٹانک برامد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

بابائے مزاح جناب اکبر الہ آبادی یہی بات کسی اور طریقے سے کہتے نظر آتے ہیں ـ

دل میں اب نورِ خدا کے دن گئے
ہڈیوں میں فاسفورس دیکھئے

جوڑ توڑ

یوں تو ہماری قومی اور گھریلو سیاست جوڑ توڑ کی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔مگر بقول شخصے جوڑوں کا درد صرف شادی شدہ جوڑے ہی جان سکتے ہیں کنوارے اسے کیا جانیں۔لیکن اصلی جوڑ وں کی کہانیاں ایک آرتھوپیڈک سرجن بہتر طور سے سنا سکتا ہے۔



جہاں اصلی آرتھوپیڈک سرجن ہمارے لئے باعث شفا ہو سکتا ہے وہیں ہڈیوں کے جعلی ڈاکٹر اور پہلوان حضرات لوگوں کے لئے باعث نقصان بھی ہو سکتے ہیں ـ

پہلوان ہے ایک جوڑوں کا ماہر
ٹوٹے جو ہڈی جوڑے یہ ساحر
بے ایکسرے ہیں اس کے مظاہر
اندر کی چوٹیں دیکھے یہ باہر
"ایف۔آر۔سی۔ایس" سرجن بچارے
بیٹھے ہیں فارغ سارے کے سارے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی



ماہرِ ہڈی و جوڑ

محبوب اگر ماہر ہڈی وجوڑ ہو تو عاشق بے خوف ہو کر پکار اٹھتا ہے ۔

دیکھے ذرا ہمیں کوئی میدانِ عشق میں
کشتی کریں تو کھیلیں کبھی ہم کبڈیاں
محبوب اپنا "ماہرِ ہڈی وجوڑ" ہے
اب ڈر نہیں رقیب بھی توڑے جو ہڈیاں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

آرتھو پیڈک ڈاکٹر کی فیس

کوچۂ عشق میں کیا خوب پذیرائی کی
اس محبت نے مری ہر طرح رسوائی کی
چک پڑی ہائے دکھائی جو ادائے اُلفت
فیس سرجن نے دھرالی مری انگڑائی کی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مری ٹانگ کی ایک ہڈی تھی ٹوٹی
کسی ڈاکٹر نے وہ پھر جوڑ دی ہے
ریسپشن پہ بل جو ملا مجھ کو آذر
اسی بل نے میری کمر توڑ دی ہے

ندیم آذر

مریض اور امراض ہڈی و جوڑ

جراح سے عجیب سا قائم ہے رابطہ
اس کو نئے مریض دلاتی ہیں سیڑھیاں

اقبال شانہ



مریض کے فائدے

جوڑوں اور ہڈیوں کے درد کے مریض جس قدر اپنی بیماری کے کرب سے واقف ہو سکتے ہیں اسے بھلا کوئی اور کیا سمجھے۔ مگر شاعرانہ خوش طبعی ساتھ ہو تو درد و غم کی فضا میں بھی مسکراہٹ کی بجلیاں کوند کر تھوڑی دیر ہی صحیح گدگدا جانے کی سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش ضرور کرتی ہیں:

کہا طبیب نے جوڑوں کا درد ہے حضرت
یہ بات سن کے وہ کرسی پہ اور جھول گئے
مگر جو سوچا کہ بیوی دبائے گی پاؤں
خوشی سے اُن کے وہیں ہاتھ پاؤں پھول گئے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

نہیں پیسے تو یہ طعنہ نہیں ہے
کہ ہم کو ڈر گرانی کا نہیں ہے
ہے گٹھیا کے مرض کا فائدہ بھی
مٹن اور بیف اب کھانا نہیں ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

عشاق کے لئے جوڑوں کا درد اگر باعث زحمت ہوتا ہے تو کبھی کبھی یہی درد باعث رحمت بھی بن جاتا ہے۔اپنی اپنی فکر کے مطابق دو مزاح گو شعرا نے یہ کیفیت کس طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے ذرا ملاحظہ فرمائیں ۔

جوڑوں کے مریض آئے کبھی بزم میں تیری
بیٹھا ہے جو اک بار مقدر سے اٹھا ہے

عرفان قادر

دور ہو کیسے بھلا رنجِ فراق
گرچہ ملنے کی بڑی خواہش ہے
جانِ جاں ہو گیا چلنا دُوبھر
"سوزشِ جوڑ" کی یہ سازش ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

فالج کی ایک بہت بڑی وجہ پولیو ہے۔حفاظتی ٹیکہ جات کا کورس بچوں کو اس بیماری سے دور رکھتا ہے۔سائنسی ترقی کے باعث پوری دنیا ماسوائے افغانستان اور پاکستان کے اس بیماری کا قلع قمع ہو چکا ہے۔پولیو ویکسین کی یہ کامیابی شاعر کو ایک نیا زاویہ نگاہ عطا کرتی ہے

عیب دار ہونے سے یہ بھی بچ گیا ہوتا
ماہرین اس کو بھی گر یہی دوا دیتے
اس قدر نہ لنگڑاتا یے نظام جمہوری
پولیو کے قطرے کچھ اس کو بھی پلا دیتے

انور مسعود

پلستر

یہ ممکن نہیں کہ شعبہء ہڈی و جوڑ کی بات ہو اور پلستر کا ذکر نہ ہو۔گھر سے باہر ہڈیاں ٹریفک کے حادثے میں ٹوٹیں یا گھر کے



اندر بیوی لڑائی جھگڑے میں توڑے مآل کار انہیں جوڑنے کے لئے پلستر کا سہارا ہی لینا پڑتا ہے۔پلستر کے بعد ڈاکٹر صاحب احتیاط کا لیکچر بھی دیتے ہیں بلکہ مزاحیہ شاعر تو محاورتاً بھی مریض کو ٹانگوں کی کھینچا تانی سے منع کرتا ہے ۔

کیوں کھینچتے ہو ٹانگ مری بات بات پر
آتا نہیں نظر ہے پلستر لگا ہوا

شوکت جمال

کمر

معشوق کی پتلی کمر کے ذکر سے اردو زبان کے شعرا کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔۔۔کہ ع

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
سنجیدہ شاعر مرزا آبرو کمر کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

تمہارے لوگ کہتے ہیں کمر ہے
کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے

مرزا آبرو



مگر شادی کے بعد اسی معشوق کی کمر بیوی کے روپ میں سامنے آتی ہے تو شاعر بے اختیار پکار اٹھتا ہے ۔

ڈائیٹنگ کھیل نہیں چند دنوں کا بیگم
اک صدی چاہئے کمرے کو کمر ہونے تک

سرفراز شاہد

اکبر الٰہ آبادی مغرب کی ترقی سے ہر وقت خائف نظر آتے ہیں ۔

مغرب نے خوردبیں سے کمر ان کی دیکھ لی
مشرق کی شاعری کا مزہ کرکرا ہوا

اکبر الٰہ آبادی

درد کمر

بتوں کے عشق سے کب تک نہ باز آئے گا تو لق لق
کمر بھی اب تو تیری دیکھ ٹیڑھی ہوتی جاتی ہے

حاجی لق لق

کمر میں تیری ہو عرق النسا کا درد ایسا
مرے قریب ہی بیٹھی رہے اٹھا نہ کرے

خالد عرفان

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
چک پڑ گئی تو چھوڑ دیے بلبلا کے ہاتھ

شوکت جمال

وجوہات

آرتھو پیڈک ڈاکٹر صاحبان کے نزدیک درد کمر کی بہت سی وجوہات ہیں مگر ہمارے مزاحیہ شعرا نے درد کمر کی جو دور از کار وجوہات نکالی ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔

شاگرد کی کمر کا کڑاکا نکل گیا
استاد تیرے شعر کا مصرع اٹھانے میں

سرفراز شاہد

بوجھ رشوت کا اٹھایا اس قدر
پڑ گئی چک ٹل گئی صاحب کی ناف

عظیم عباسی

کہتے تھے ایک اورتھو پیڈک کے ڈاکٹر
کر کے معائنہ بڑے صبر و قرار سے
ان کی کمر میں ہم کو تو آیا نظر نہ خم
جو کہہ رہے ہیں ٹوٹی کمر ہجر یار سے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اب تک گئی نہیں ہے عنائت کمر کی چک
حالانکہ ناز اٹھائے زمانے گزر گئے

عنائت علی خان

شیطانیوں میں کیا ہے مزا ہم سے پوچھئے
کس طرح گھیرتی ہے قضا ہم سے پوچھئے
اب تک کمر کے درد سے پیچھا نہیں چھٹا
عورت کو چھیڑنے کی سزا ہم سے پوچھئے

کلیم شمر بدایونی

نہیں جاتا کمر کا درد تب سے
کہ جب سے مہر مہنگائی نے دابا

لیفٹنٹ کرنل محمد خالد خان مہر

ایک جھانپڑ جو لگا سیدھی ہوئی اپنی کمر
بولیں بیگم کہ اثر رکھتی ہے گھر کی ٹانک
جب سے منسوب ہوئے رہ گئے منصوبے دھرے
سات بچے ہیں بس اب اُن کی کمر کی ٹانک

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جب مجھے دردِ کمر یاد آیا
ان کی مالش کا ہنر یاد آیا

اقبال فردوی

برسوں کے بعد چک مری فوراً نکل گئی
ماری جو اس نے میری کمر پر گھما کے لات

خالد محمود

بارہ سو فوم کے گدے میں گئے
ہے وہی درد کمر کی صورت

مرزا عاصی اختر

درکار ہے کمر کو کوئی اور سانحہ
مہنگائی سے تو اپنی کمر ٹوٹتی نہیں

ضمیر جعفری

وہ کہتے ہیں غزل پڑھ دو میں کہتا ہوں کہ پیسے دو
سبب یہ ہے کہ مہنگائی سے پاگل ہوگیا ہوں میں

کمر تھکنے لگی ہے مشق پرواز تخیّل سے
کمر، شل دیکھ کے اپنی "کمرشل" ہوگیا ہوں میں

خالد عرفان

بنا کر زندگی کی ہر اک شے کو تجارت
سمجھتا تھا کہ مشکل مری حل ہوگئی ہے
نمود ظاہری کا مگر ہے بوجھ اتنا
"کمرشل" ہوتے ہوتے کمر، شل ہوگئی ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

حقیقت ہے اداکاری نہ سمجھو
بیاں کو میرے سرکاری نہ سمجھو
کمر مہنگائی نے توڑی ہے میری
اسے مہروں کی بیماری نہ سمجھو

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

گھٹنہ

طبیعت ہوتی آمادہ نہیں ہے میری ورزش پر
توجہ ان دنوں مرکوز ہے گھٹنوں کی ورزش پر

شوکت جمال



میرا درد گھٹنے کا پھر بڑھ رہا ہے
مرے لڑکھڑانے کے دن آرہے ہیں

ممتاز راشد

چل چل کے کوئے یار میں ٹانگیں کھڑک گئیں
گھٹنوں کے شاک ٹخنوں کی ٹوٹیں کمانیاں

خالد محمود

وہ شلنگ اور ترنگ خواب ہوئی
بس پرائی لکیر پیٹتے ہیں
آپریشن کے باوجود اب بھی
گھٹنا ٹوٹا ہوا گھسیٹتے ہیں

ضمیر جعفری

اپنا گھٹنا تو بدلوایا ہے لندن میں ضمیر
اقربا کو اس کا خمیازہ بھی بتلاتے رہو
کل اثاثہ اب یہ گھٹنا ہے مرے مرنے کے بعد
مرے بچو میرا گھٹنا بیچ کر کھاتے رہو

ضمیر جعفری

اک سر گراں زانو ہوگیا ہے دوزانو
جسم کا یہ کارندہ کام سے گریزاں ہے
اتنی فالتو چربی کب تلک لئے پھرتا
گھٹنے میں گھٹالا ہے ٹخنہ پا بجولاں ہے
تن میں الٹرا سونک بجلیاں بلو ڈالیں
سیل برق حاطف سے ہڈیوں کا درماں ہے
آتشِ رگِ جاں سے یہ مریض بے چارہ
جیسے دور حاضر کا بدحواس انساں ہے
چارہ گر کی پرسش سے حال عرض گزرایا
دل میں گھپ اندھیرا ہے ٹانگ میں چراغاں ہے

ضمیر جعفری

فزیو تھراپی

شعبۂ ہڈی و جوڑ فزیو تھراپی سے اس طرح منسلک ہے کہ دونوں شعبے ایک دوسرے کے قرب و جوار میں پائے جاتے ہیں۔



جوڑوں اور ہڈیوں کے آپریشن کے بعد اور اس کے علاوہ معذوری میں بھی فزیو تھراپی کا عمل مریض کو مکمل صحت بخشتا ہے۔ دیکھا جائے تو فزیو تھراپی ورزش ہی کی ایک ڈاکٹری شکل ہے، کہ اول الذکر مرض میں اور آخر الذکر دورِ صحت میں انسان کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے:

ورزش
(نظم)

چلو پھر آؤ لیں اپنا خراج ورزش سے
بنائیں سہل سبھی کام کاج ورزش سے
علاج کرتے ہیں بس کھیل کود سے اب تو
یہ فزیو تھیریپی کیا ہے، علاج ورزش سے
کہا یہ ہم سے کسی پہلواں نے چپکے سے
رکھی ہے جسم کی بس ہم نے لاج ورزش سے

مشین جسم کی بیکار ہو نہ جائے کہیں
کرو بدن کا ذرا تم مساج ورزش سے
بڑھاپے کو ہے اگر ڈر تو صرف ورزش سے
جوانی کا ہے فقط ہم پہ راج ورزش سے



دماغ اس سے تر و تازہ، جسم اس سے جواں
رہے گا آپ کا اچھا مزاج ورزش سے
نہیں بدن میں ہے کچھ اضمحلال اس کے سبب
سجا ہے سر پہ یہ صحت کا تاج ورزش سے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مگر کچھ لوگ صرف تالیاں بجانے، روٹیاں پکانے، کھانا کھانے، اور واش روم آنے جانے کو بھی ورزش سمجھتے ہیں ۔

روٹیاں دس کھا کے ورزش کے لئے
کھیلتے رہتے ہیں کیرم کیا کریں

عرفان قادر

فزیو تھراپسٹ

خود کو جو فزیو تھراپسٹ کہا کرتا ہے
چہرے مہرے سے تو اک مالشیا لگتا ہے

عرفان قادر

فزیو تھراپی

مالش یا ٹوٹکا یا مداوا کرے کوئی
بیمار عشق کو بھی تو اچھا کرے کوئی

شوکت جمال

اس سرزنش کا اُن پہ اثر ہو گا کچھ نہیں
اسپیچ تھیراپی سے نہ یوں کام لیجئے
لاتوں کے بھوت مانتے باتوں سے کچھ نہیں
اب فزیو تھیراپی سے ہی پیغام دیجئے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی



ڈاکٹر عزیز فیصل

ترے ساتھ خفیہ جو یہ رابطے نہ ہوتے
تو یہ گیٹ میرے دل کے کبھی یوں کھلے نہ ہوتے

ہوا آج دولھے جی کا وہیں تیسرا ولیمہ
جو یہ مارکی نہ ہوتی تو یہ معرکے نہ ہوتے

میں مزاح لکھ رہا ہوں یہی بات دل میں رکھ کر
مری آنکھ اشک لکھتی جو یہ چٹکلے نہ ہوتے

ہے زحل کی یہ کہاوت، یہ اکھان مشتری کا
نہ زمیں پہ ہوتے شاعر تو مشاعرے نہ ہوتے

سبھی شوہروں کے دل پر، یہی سچ لکھا ہوا ہے
جو یہ بیویاں نہ ہوتیں، کوئی مسئلے نہ ہوتے

کسی اک بھی سرپھری کا نہ علاج ہونے پاتا
مرے شہر میں ہزاروں جو یہ سرپھرے نہ ہوتے

ڈاکٹر عزیز فیصل

بائیں طرف جو تیسرا واقع ہے گھر یہاں
میری لڑی ہے بارھویں پہلی نظر یہاں

اک پارلر پہ لکھا ہوا تھا بڑا بڑا
ہوتا ہے دور مونہہ کا اصلی کلر یہاں

رشتہ کرانے والی کے لکھا تھا گیٹ پر
ملتے ہیں ہر مزاج کے ساس وسسر یہاں

اک چارٹ پر حکیم نے لکھا تھا ہاتھ سے
بنتے ہیں خاص قسم کے کچھ ڈاکٹر یہاں

اے گیسٹ کان کھول کے سن لے یہ فیصلہ
کھانا نہیں ملے گا تمہیں پیٹ بھر یہاں

کہتا ہوں روز جا کے میں خالی پلاٹ سے
اک دن بنے گا میری بشیراں کا گھر یہاں

کس نے لکھا ہے ایک کرکٹر کے گیٹ پر
رہتا ہے زن مریدی کا اک اوپنر یہاں

عشاق جائے وصل پہنچتے ہیں دیر سے
چلتی ہے ایسی سست سی اب کوسٹر یہاں

چڑیا گھروں پہ لکھا ہوا تھا یہ انتباہ
رہتا نہیں ہے ایک بھی اب جانور یہاں

پوچھا ہے مجھ سے قیس نے ازراہ اشتیاق
ڈیرہ لگائے بیٹھے ہو تم بھی کدھر یہاں

وہ مر گیا تو اس کا حوالہ بنے گا خاک
پھرتا ہے آج کل جو بڑا نامور یہاں

ہر شے کے انجنوں کی طبیعت خراب ہے
بیروزگار پھرتے ہیں انجینئر یہاں

جس کو حیاتیات میں کہتے ہیں دل میاں
چوبیس سات (7/24) رہتا ہے بیوی کا ڈر یہاں

پڑھ لو یہ سوچتے ہوئے فیصل کی شاعری
سب کو فری ملے گا بہت لافٹر یہاں



چاند نگر



محاورے۔۔حکمتیں۔۔۔حماقتیں

از: صفدر علی حیدری



آج تک خطاب اور لقب میں فرق سمجھ نہیں پائے۔ محاورے اور ضرب المثل کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔۔۔ آج ہم محاوروں اور اس میں چھپی حکمتوں اور حماقتوں پر غور کرتے ہیں۔

مرد کی ایک زبان ہوتی ہے

کیا عورتوں کی دو ہوتی ہیں؟

پھر یہ سنتے تھے کہ مسلمان کی ایک زبان ہوتی ہے، ہمیں کوئی ایسا غیر مسلم نہیں ملا نہ کوئی عورت ملی ہے کہ جس کی ایک سے زیادہ زبانیں ہوں۔۔۔ زبان ایک ہی ہوتی ہے مرد کی ہو عورت کی ہو یا کسی کافر کی۔۔ ایک اور پوری کی پوری ایک۔۔۔ نہ کم نہ زیادہ۔۔۔ اس بے تکے محاورے کے تخلیق کار کا تو معلوم نہیں ہو سکا۔۔ ہاں البتہ اس کو لغت سے مٹانے کا جواز معلوم ہو گیا۔ سو اس کو فی الفور لغت سے حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہیئے۔

ہمت مرداں مدد خدا

اب یہ تو بڑی ناانصافی ہے ان عورتوں کے ساتھ جو مشکل ترین حالات کا بڑی جواں مردی اوہ سوری "جواں عورتی" کے ساتھ مقابلہ کرتی ہیں۔ سو ہمتِ مرداں مددِ خدا کا محاورہ بدلنے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس سے صنفی امتیاز کی بو آتی ہے۔۔۔ سو عورتوں کی ہمت کے

لیے ''ہمت عورتاں مدد خدا'' کا استعمال جائز قرار دیا جانا چاہیے۔

چندا ماموں

اب کوئی پوچھے کہ یہ ماموں کیوں ہوتا ہے چاچو کیوں نہیں ہوسکتا۔ کیا اسے چاچو کہا جائے تو چاند ناراض ہوجائے گا؟ فی الفور اسے چندا چاچو قرار دیا جائے یا چندا ماموں کے ساتھ چند چاچو کا استعمال بھی مسنون قرار دیا جائے۔

مادری زبان

یہ مادری ہی کیوں ہوتی ہے؟ فادری (پدری) کیوں نہیں ہوسکتی؟؟ کیا مرد کے منہ میں زبان نہیں ہوتی؟؟؟

کیا وہ بے زبان ہوتا ہے؟؟؟؟

شاید مادری زبان کے حامی یہ جواز پیش کریں کہ مرد کو گھر میں بولنے کی اجازت تب ناں۔۔تب اسے پدری کہنے میں کوئی حرج نہ ہو گا۔ جب تک شوہروں کو گھر میں بات کرنے کی اجازت مل نہیں جاتی زبان مادری ہی رہے گی۔۔ پدری نہیں ہوسکتی۔ چچا غالب نے اپنی زبان اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کچھ غلط تو نہیں کہا تھا

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف

اس بات سے بھی صنفی امتیاز کی بو آتی ہے۔وہ شوہر کا بھائی کیوں نہیں ہوسکتا۔۔۔؟

غریب کی جورو سب کی بھابھی

غریب کی جورو سب کی بھابھی ہوسکتی ہے تو غریب کیوں سب کا بھائی نہیں ہوسکتا؟

بھانجے تو شیر کو بھی اچھے لگتے ہیں

لو کر لو گل

شیر کو بھتیجے بھی اتنے ہی پسند ہیں!

اگر یقین نہیں آتا تو کسی بھی شیر سے پوچھ سکتے ہیں۔۔۔

بلی شیر کی خالہ ہے

بلی شیر کی خالہ کیوں ہے؟ پھوپھی کیوں نہیں ہوسکتی؟؟

جنات کو بھی نانے مامے کہا جاتا ہے

تایا چاچا نہیں۔۔ جانے کیوں۔۔۔

میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے

لگتا ہے یہ محاورہ قدیم دور کی یادگار ہے کیوں کہ ہم نے کوئی گاڑی ایسی نہیں دیکھی جس کے دو پہیے ہوں (سائیکل اور موٹر سائیکل کو اب گاڑی تو نہیں کہہ سکتے) گاڑی کی بجائے گدھا گاڑی کہا جائے تو تب اعتراض ختم ہوسکتا ہے۔ گدھا گاڑی کا لفظ مناسب ترین اس لیے بھی ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ اسی طرح گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہے جیسے گدھا گاڑی یا پھر بیل گاڑی!

مردوں والا قول

یہ بھی صنفی امتیاز سے لباب ہے۔۔۔کیا ضروری ہے کہ ہر مرد وعدے کا پکا ہو اور عورت بے وفا۔۔۔صورت حال الٹی بھی تو ہو سکتی ہے سو اس بات میں ہمیں حکمت کی بجائے حماقت زیادہ نظر آتی ہے۔

جنگ عورتوں کا کھیل نہیں ہوتی

یہ بات بھی صنفی امتیاز کے زمرے میں آتی ہے۔ اب تو فوج میں بھی عورتوں کی خاصی تعداد بھرتی کی جاتی ہے۔ اور اب امن کے ساتھ ساتھ جنگ میں ان کا کردار نمایاں ہے۔ فوج میں بھی عورت کی ذمہ داریاں ایک سے زیادہ ہوتی ہیں۔ سو اس پر از حماقت بات کو زبان زد عام بننے سے روکا جائے اور اس کو زبان پر لانے سے پہلے کئی بار سوچا جائے۔

جمبو

از: **کے ایم خالد**



رات کے بارہ بج چکے تھے اور یہ روزانہ کا معمول کا حصہ تھا میں نے اپنی قینچی چپل پہنی رات کو باہر جاتے عموماً میں یہی چپل پہنتا تھا کیونکہ یہ آواز کم کرتی تھی ہمارا ڈبل اسٹوری مکان تھا جس کے اوپر والے پورشن کا ایک کمرہ مجھے ملا ہوا تھا۔ میں سیڑھیوں سے اتر کر نیچے صحن میں آیا چونکہ کمبائن فیملی سسٹم کے معاہدے میں یہ بات طے تھی کہ رات بارہ بجے کے بعد کوئی پارٹی یا اس کے بچے سوائے اپنے کمرے کے کہیں ادھر ادھر نظر نہیں آئیں گے۔ اس معاہدے کی پاسداری میں نیچے سناٹا تھا۔ مجھے دو کمروں سے نکل کر باہر کی طرف جانا تھا پہلے کمرے میں چھوٹا بھائی غیر شادی شدہ سکونت پذیر تھا جو کہ چوبیس گھنٹے چوکس ہی رہتا تھا اس سے اگلا بیٹھک نما کمرہ ابا اور اماں کے زیر تصرف تھا اس کا دروازہ باہر سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ بھائی کسی گیم میں مصروف تھا اس نے میرے گزرنے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ میں نے بیٹھک کی چٹخنی غیر محسوس طریقے سے نیچے کی روزانہ کے معمول کی وجہ سے یہ کم ہی آواز دیتی تھی۔ باہر نکل کر میں موٹر سائیکل کے اتارے ہوئے لاک سے بیٹھک کا دروازہ بند کیا اس کے باوجود کہ مجھے پتہ تھا ابا جاگ رہے تھے جب تک سارے سو نہیں جاتے تھے ابا جاگتے رہتے تھے۔

باہر نکل میں نے ایک گہرا سانس لیا سڑک پر ہو کا عالم طاری تھا میں نے گھڑی دیکھی وہ بارہ بج کر بیس منٹ بتا رہی تھی اس کا مطلب تھا مجھے چھت سے اتر کر باہر نکلنے میں بیس منٹ لگ گئے تھے دن میں یہ دورانیہ دو منٹ سے زائد نہیں تھا۔ غوثیہ چوک میرے گھر سے پیدل نارمل واک سے پندرہ منٹ کا رستہ تھا لیکن مجھے دس منٹ میں چوک تک پہنچنا تھا ورنہ۔۔۔۔ اور میں اس کا تصور ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں تقریباً بھاگتا ہوا چوک میں پہنچا تو چاچا بوٹا دوکان کا شٹر نیچے کر رہا تھا۔ اس نے میرے لئے شیشہ کی کوکا کولا کی بوتل باہر کاؤنٹر پر رکھی ہوئی تھی۔

"اوئے کبھی دس منٹ پہلے بھی آ جایا کر، میں بند کر جاتا تو تجھے فوارہ چوک جانا پڑنا تھا وہ ساری رات کھلا رہتا ہے"۔

"بس نکلتے دیر ہوگئی، چاچا آج یہ نہیں جمبو بوتل دے دو چلو دو دو گلاس پی لیں گے آج تنخواہ ملی ہے ویسے جمبو میں کتنے گلاس ہوتے ہیں"۔

"نو گلاس کہتے ہیں لیکن اگر تھوڑی محبت بانٹنی ہو تو بارہ چودہ بھی بن جاتے ہیں"۔ اس نے مسکراتے ہوئے جمبو میرے ہاتھ میں پکڑائی اور شٹر نیچے گرانے لگا۔

میں بیوی کے لئے روزانہ بوتل لینے آتا ہوں بس یہ اس کی پیٹ کی درد میں افاقہ دیتی ہے یا نشہ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں اس نے مسکراتے ہوئے بار ہا مجھ سے کہا

"بوتل وہ جس میں گیس کوٹ کوٹ کر بھری ہو، اس نگوڑی بوتل اور لانے والے کو بندہ آگ لگا دے جس میں سے گیس نہ نکلے"

"تو بوتل اور محبت بانٹنی ہو تو چودہ گلاس بھی نکل آتے ہیں"۔

چاچا بوتا بار بار سامنے آ کر کہہ رہا تھا میں نے حساب لگایا اماں اور ابا، ایک چھوٹا بھائی، ایک منجھلا بھائی اس کی بیوی اور دو بچے، ایک بہن چار بچوں ساتھ رہنے آئی ہے۔ ایک میں اور میری بیوی یہ ٹوٹل تیرہ لوگ بنتے ہیں تو کیوں نہ آج محبت بھی جمبو کے ساتھ بانٹ لیں۔

میں نے دروازہ کھولا تو ابا کی آواز آئی "بشیر تو نے کسی دن چوری کروا دینی ہے"۔

"نہیں ابا میں باہر سے لاک کر کے گیا تھا آپ بتائیں بوتل پینی ہے"۔

"بیوی کے لئے لایا ہو گا محبت میں پوچھ رہا ہے، نہیں جا میں نے پھکی کھائی ہوئی ہمارا پیٹ کا درد تو پھکی سے ہی ٹھیک ہو جاتا ہے"۔

"نہیں ابا جمبو لایا ہوں سب گھر والوں کے لئے"۔ یہ سن کر اماں بھی اٹھ چکی تھی

"پتر اس بڑھاپے میں کہاں نیند آتی ہے اوئے صغیر" اماں نے ساتھ والے کمرے میں چوکس چھوٹے بھائی کو آواز دی۔

"جا سب کو بلا کر لا بشیر سب کے لئے جمبو بوتل لایا ہے، بہن کو پہلے بلانا"۔

"اماں میں نے ابا اور بھائی کی باتیں سن کر سب کو وٹس اپ میسج کر دیئے تھے"۔ صغیر اپنا موبائل دکھانے لگا۔

میں نے دیکھا چند سے پہلے جو گھر سویا ہوا محل بنا ہوا تھا اب جنگل میں منگل کا سماں پیش کر رہا تھا۔ بہن اپنے بچوں سمیت ایک ٹرے میں گیارہ بارہ گلاس سجائے ہوئے اندر داخل ہوئی اس کے پیچھے بھائی اس کی بیوی اور بچے تھے ان میں سے کوئی بھی ہنگامی طور پر اٹھا ہوا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جمبو بوتل بہن کو پکڑا دی اس نے گلاسوں میں ڈالنی شروع کر دی۔ محبت گیارہ گلاسوں میں پوری ہو چکی تھی۔ بوتل میں ایک گلاس سے کم کوک تھی سب نے اپنا اپنا گلاس اٹھا لیا سارے ہاتھوں میں گلاس پورے ہو گئے۔

"میں اپنا گلاس بھابھی کو دے آتی ہوں" بہن نے اٹھتے ہوئے کہا

"نہیں نہیں تم پیو یہ بوتل میں ہے ناں، ویسے بھی وہ سو گئی ہو گی"۔

"تو پھر تم پی لو ناں بشیر پتر" ابا نے محبت سے کہا۔

میں نے جمبو بوتل کو منہ لگایا تو نہ گیس نہ ذائقہ، میں غٹ کر کے پی گیا وہ سارے اتنی دیر بیٹھے جتنی دیر گلاسوں میں بوتل تھی۔ اُن کے جانے

کے بعد گھر دوبارہ سویا ہوا محل دکھائی دے رہا تھا۔

"بشیر پتر جاتا کیوں نہیں، کوئی بات کرنی ہے کیا؟"

"نہیں ابا۔"

میں نے اندر جانے کی بجائے باہر کا رخ کیا خیالوں میں بیوی کی سرخ ہوتی آنکھیں ایک ہی بات کہہ رہی تھیں۔

"بوتل وہ جس میں گیس کوٹ کوٹ کر بھری ہو، اس نگوڑی بوتل اور لانے والے کو بندہ آگ لگا دے جس میں سے گیس نہ نکلے"

چاچے بوٹے نے بتایا تھا فوارہ چوک دوکان ساری رات کھلی رہتی ہے۔

بگلے

از: گوہر رحمٰن گہر مردانوی

اُس زرافہ گردن اور عوج بن عنق جیتی قامت والے کلرک کو دیکھ کر نہ جانے کیوں بگلا یاد آنے لگا۔ کمپیوٹر میں آنکھیں گھسائے، کی بورڈ پر بگلا بھگت بنا ہماری آؤ بھگت بھلا کیسے کرتا، جبکہ ہم اس انتظار میں رہے کہ کب وہ دریائی گھوڑے جتنا منہ کھول کر رُوکھے انداز میں مخاطب کر کے کہے گا "کیا کام ہے؟"۔۔۔ مگر ہائے افسوس ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا، جیسے اُس کے سامنے جیتا جاگتا انسان نہیں، کوئی بھوت کھڑا ہو اور وہ اسے دیکھ نہیں سک رہا ہو۔ دریں اثناء میرا ہمراہی فقیرا دفتروں کا مارا میرے پاس آ کر کہنے لگا "ہوا کام؟"

میں نے کدو جتنا سر نفی میں ہلا دیا کیونکہ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے چوتھے بگلے کے پاس جا جا کر ویسے بھی کدو (ماؤف) ہو گیا تھا۔ فقیرے نے ہمیں تقریباً کھینچنے کے انداز میں ہاتھ سے پکڑ کر باہر نکال لیا اور گویا ہوا "ارے بدھو۔۔۔ مٹھی گرم کر مٹھی!"

"لیکن میرے پاس ماچس کہاں ہے!" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا

"اُف۔۔۔ فو۔۔۔ یار تم نرے بدھو کے بدھو رہے۔۔۔ ذرا دانہ پانی ڈال دو۔۔۔ چارا پھینکو" فقیرا جھنجھلا گیا۔

چارا؟ کیا وہ جانور ہے جو چارا ڈال دُوں؟؟" میں نے پھر سادہ لوحی کا بھرم رکھتے ہوئے کہا کیونکہ میرا اس سے قبل اُن بگلوں۔۔۔ اوہ نہیں۔۔۔ بابوؤں سے کبھی پالا ہی نہیں پڑا تھا۔ اب آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ زرافہ عوج بن عنق اور بگلے میں کیا مماثلت ہے جو مضمون کے آغاز میں داغے گئے تھے تو عرض کیے دیتے ہیں کہ لمبا قد کاٹ اور گردن، رکھنے والا وہ بگلا۔۔۔ اوہ معاف کیجیے گا بابو۔۔۔ ٹکا ٹک ٹکا ٹک کلرک صاحب ہمیں درخور اعتنا اس لیے نہیں سمجھ رہا تھا کہ ہم نے اُن کی مٹھی گرم نہیں کی تھی۔ اب فقیرے، میرے ساتھی نے ہمیں باہر لے جا کر سمجھا دیا تو سمجھ گئے کہ گھی انگلیاں ٹیڑھی کر کے ہی نکالی جاتی ہے، اس لیے جیب سے پانچ سو کا سرسبز نوٹ نکال کر دوبارہ اُس بگلے کے پاس جا پہنچے۔

اب آپ لوگ یہ بھی سوچ رہے ہونگے اس نگوڑے کلرک کو بار بار بگلا کیوں کہا جا رہا ہے تو بھائیو ذرا دھیرج رکھو، ضروری نہیں کہ ہر بات سیدھی کی جائے۔ کچھ گھما پھرا کے آپ کے ذھن کی ورزش بھی ضروری ہے نا، پھر بتائے دیتے ہیں بلکہ خود پتہ چل جائے گا۔

جناب جیسے ہی ہم دوبارہ اُس حکومتی کل پرزے کے پاس جا پہنچے تو اس مخمصے کا شکار ہو گئے کہ اب بلی کے گلے میں گھنٹی کیسے باندھیں۔ اِسی کشمکش میں شائد بگلے صاحب کو بھی اندازہ ہوا کہ چوزہ ہے، ابھی انڈے دینے سے یارا نہیں اس لیے کہا "کیا بات ہے بھئی؟"

ب ب ب۔۔۔ بگ۔۔۔ لے۔۔۔ لفظ ہونٹ تک آتے آتے دم توڑ گیا "ب ب بھائی یہ پیسے۔۔۔ ہم نے سبز باغ دکھا دیا جس میں

قائد ملت محو نظارہ تھے۔

بگلے نے ادھر اُدھر اپنی لمبی گردن نہوڑ کر دیکھا مبادا کہیں دوسرا انزدیکی بگلا تو نہیں تاڑ رہا۔

"اس کا کیا کروں؟" اس نے چور لہجے میں کہا۔

"بھائی صاحب لے لیں!" ہم نے سادگی سے کہا۔

"اچھا اچھا بیٹھ جاؤ!!" وہ سمجھ گیا کہ چوزہ نیلام شدہ عزت کی بے عزتی کا کباڑا کرنے والا ہے۔۔۔سر پھر کمپیوٹر میں دے دیا جس طرح بگلا کبھی کبھی سر اپنی ٹانگوں میں چھپا دیتا ہے۔اس نے پھر مدھم آواز میں مجھ سے کہا "یہ چائے کے لیے شیرو چپڑاسی کو دے دو، باہر بیٹھا ہے۔"

ہم سمجھ گئے کہ یہ کام تھرو پراپر چینل through proper channel ہی ہوگا اس لیے دوبارہ باہر گئے اور نوٹ چپڑاسی کو دے کر کہا کہ صاحب چائے مانگ رہے ہیں۔

چپڑاسی نے بھی کتے کی طرح غپ کے ساتھ نوٹ اچک لیا اور کہا "ٹھیک ہے تم جاؤ بابو صاحب کے پاس، لا رہا ہوں چائے۔"

اب جو بگلے صاحب کے پاس آئے تو فضا ہی الگ تھی۔ بڑے احترام سے کہا "لا کیا کام ہے؟"

ہم نے فائل آگے کی اور کہا "سر، جی پی فنڈ سے کچھ رقم درکار ہے، بچے کا اپریشن کرنا ہے، آپ مینول دیں اور ڈی ای او صاحب سے سینکشن sanction دلوا دیں!"

"جی ہو جائے گا، بے فکر رہو۔۔۔کل پرسوں تک یہ فائل چھوڑ دو۔۔۔دو دن بعد آ کر مجھ سے لے لینا۔" بگلا اب موڈی ہو رہا تھا۔ ہم بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ خیر سے کام ڈن ہے۔ اس لیے "جی ٹھیک ہے" کہہ کر اٹھنے لگے کہ اس نے کہا دھیمے سے انداز میں کہا "جب بھی کوئی کام ہو، سیدھے میرے پاس لے آنا۔ اب چائے آرہی ہے وہ پی کر جانا۔"



میرا ذہنی تناؤ سے چونکہ ختم ہو گیا تھا، اس لیے بیٹھ گیا۔ جب تک اپنی چائے نہیں آئی تھی۔ دوران چائے نوشی بندہ اور میٹھا ہوا اور بے تکلف ہو کر پھیلتا گیا۔۔۔یعنی پانچ سو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ہم یہ سوچ کر ہلکان ہوئے جا رہے تھے کہ رب کی پکڑ ہوگی کیونکہ مجبوری ہی سبھی راشی کے ساتھ مرتشی بھی خاشاک جہنم بنے گا لیکن مرتے کیا نہ کرتے، جب ایک جائز کام کرنے میں دفتر والے مہینوں لگا کر بھی ٹال مٹول کریں گے اور فرائض منصبی کو بار بار متاثر کر کے ان بگلوں کے پاس آئیں گے تو مجبوری ہے کہ کچھ دے دلا کر جلدی نمٹا جائے۔

اس پہلے تجربے سے اتنا ہوا کہ ان بگلہ نما کلرکوں کے بارے میں پہلے مفروضے قائم کرتا رہتا، اب حقیقتاً دیکھ کر یقین ہوا کہ دولہا بھائی کیوں ہماری طرف والے دفاتر میں ڈیوٹی نہیں کرتے اور مردان کے باسی ہو کر ملاکنڈ جاتے ہیں۔ یہاں ہم اسے تنگ کرتے کہ ہمارا کام مفت میں کردو اور وہ اپنے

ساتھیوں کی عادت سے واقف ہمیں رشوت دینے کے مشورے سے باز رہتے۔

قصہ مختصر جس سرکاری ملازم سے پوچھو، وہ ان لوگوں کے بارے میں دو رائے نہیں رکھتا۔ سب کہتے ہیں ہرے سرخ ارغوانی باغ نوٹ دکھاؤ اور اپنا الو سیدھا کرو اور یہ بگلے گردنیں موڑ کر ٹانگوں کے بیچ رکھ کر رشوت کی جوہڑوں سے مچھلی پکڑتے رہیں چاہے موت سامنے ہوں یا اینٹی کرپشن والے در پے ہوں۔۔۔ مگر اوپر بھی تو مگرمچھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ اینٹی کرپشن والے خود کرپٹ ہیں اور ان لوگوں کی میموری کا کرپٹ ہونا بگلوں کیلیے بڑا مفید رہتا ہے کیونکہ سب ایک بھٹی کے دانے ہیں۔ صرف **say no to corruption** جیسی اشتہار بازی سے کیا بننا جبکہ سب جانتے تو ہیں کہ دفاتر میں ایک بارہ سکیل بابو سے لیکر سیکریٹری اور چیرمین تک سارے بگلے بلکہ مگرمچھ ہیں اور سارا تالاب ہی گندہ ہے۔

بس توفیق خداوندی سے ہی معاشرے سے اس بدبو کو ختم کیا جاسکتا ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔

اب آتے ہیں عنوان اور کلرک صاحبان کے ساتھ گہرا تعلق جوڑنے کی طرف کیونکہ بہت سے دوست ایسے بھی ہونگے جو ابھی تک تعلق جوڑ نہ پاسکے ہوں گے۔۔۔ تو قارئین کرام۔۔۔ تعلق کچھ یوں ہے کہ کچھ تعلق نہیں مگر ایک مماثلت پھر بھی ہے اور یہ کہ جب بگلا ایک ٹانگ اٹھا کر مراقبے میں چلا گیا تو سمجھو کہ مچھلی سطح آب پر خود بہ خود نمودار ہو کر پھنسنے والی ہے۔۔۔ باقی نتیجہ اخذ کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔

کچھ ایماندار کلرک صاحبان جس کے گھر کا چولہا مہینے کے آغاز سے قرض مانگ مانگ کر جلتا ہے درجہ بالا تحریر سے مستثنیٰ ہیں جو دفاتر میں بھی یہ کھیل تماشے دیکھ دیکھ کر اپنا خون جلاتے ہیں۔

مشن مون

از:
نورم خان

خوبصورت پہاڑیوں کی وسعتوں میں بندروں کی ایک فیملی خوشی خوشی درختوں پر چھلانگیں مارتی کھیل کود میں مصروف رہا کرتی تھی۔ دن ختم ہوتا تو وہ چاند کے حسن سے مرعوب ہو جاتے لیکن ان کا خیال تھا کہ ۔

چاند کا حسن بھی زمین سے ہے
چاند پر چاندنی نہیں ہوتی

ایک شام وہ یونہی کھیل کود میں مصروف تھے کہ ان میں سے ایک کی نظر نیچے کنویں کے اندر پڑی جہاں چاند پانی کے اندر پڑا ٹھنڈے پانی میں کانپ رہا تھا۔ اس نے شور مچا دیا کہ ہمارا پیارا چاند کنویں میں گر گیا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام بندر اس کے پاس اکھٹے ہو گئے۔ سبھوں نے درخت کی شاخوں سے الٹے لٹک کر کنویں میں جھانکنا شروع کیا۔ واقعی وہ اندر پڑا سسکیاں لے رہا تھا اور مسلسل ہچکیوں کی وجہ سے اس کا چہرہ بھی تھر تھرا رہا تھا۔ بندروں کا سردار ایک بوڑھے بندر نے آگے بڑھ کے کنویں میں جھانکا "افسوس چاند واقعی کنویں میں گر پڑا ہے۔ اس کی جگہ تو آسمان میں جگمگانے کی تھی، کنویں کے گدلے پانی میں تھر تھرانے کی نہیں۔"

سو وہ سارے سر جوڑ کے بیٹھے کہ اپنے پیارے چاند کو کنویں سے کیسے نکالا جائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے موٹے پہاڑی بھالو سے بھی مشورہ کیا کہ ڈوبتے چاند کو کیسے بچایا جائے۔ آخرش دریا کے کنارے آرام کرتے بدہیت ہپّو کے حکم پر انہوں نے کہیں سے ایک بالٹی ڈھونڈی اور چاند کے ریسکیو کی مہم پر کمربستہ ہو گئے۔

فیصلہ ہوا کہ تمام بندر "چاند بچاؤ" مہم میں یکساں شریک ہونگے اور ایک زنجیر کی صورت بالٹی لے کر کنویں میں اتریں گے۔



سب سے بوڑھا اور جہاندیدہ بوڑھے باندر نے اپنی دُم مضبوطی سے ایک شاخ سے لپیٹی اور الٹا لٹک گیا۔ پھر اس نے ایک دوسرے باندر کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے جسم کو پکڑ کر اور نیچے جا کر اسے اپنی دُم پکڑا دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ بوڑھے نے بالٹی اسے پہلے ہی پکڑا دی تھی، یوں وہ سارے اسی طرح ایک چین کی صورت کنویں میں چاند تک پہنچ گئے۔ بس اب چاند کو کسی طرح بالٹی میں لے کر واپس چڑھنا تھا۔ لیکن سب سے اوپر بوڑھے باندر کی جان نکلی جا رہی تھی۔ اتنے سارے باندروں کا بوجھ اب اس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ سو اس کی دم شاخ سے جدا ہوئی تو سارے باندر ایک کے بعد ایک کنویں کے اندر گرتے چلے گئے۔ اس افراتفری میں بالٹی اچھل کر کنویں سے باہر جا پڑی۔ سبھوں نے اوپر نگاہ کی۔ چاند اب باہر نکل کر آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ وہ سارے خوش ہو گئے کہ ان کی کوششیں رنگ لائیں اور چاند اس کرائسس سے باہر نکل آیا۔

لیکن۔۔۔ اب ملین ڈالر سوال یہ تھا وہ خود کیسے باہر نکلیں؟۔ ان بیوقوفوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ چاند پہلے ہی آسمان میں چمک رہا تھا اور کنویں میں صرف اس کا ابترعکس تھا جو ان کور چشموں نے دیکھا تھا۔ سو اب سارے اپنی بیوقوفیوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

میں بھی کیانی ہوں

از: نوید ظفر کیانی



جی ہاں میں بہانگ دہل اس جرم کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں بھی کیانی ہوں۔ کیانی اس لئے ہوں کہ جس گھر میں پیدا ہوا ہوں وہاں جتنے افراد تھے وہ سب کے سب کیانی تھے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اس لئے میں نے بھی کیانی بننے میں عافیت جانی۔ غالباً کہیں سے سُن لیا ہوگا کہ رُوم میں رہو تو رومیوں جیسے بن کر رہو۔

بظاہر میرے کیانی ہونے میں سارا قصور میرا نہیں ہے۔۔۔ قصور تو یوں بھی میرا نہیں ہے، نُور جہاں اور انہی جیسے دیگر قصورواروں کا ہے تاہم اگر میں کیانی ہو ہی گیا ہوں تو میں نے کیانی ہوئے رہنے میں اتنی دیر لگا دی ہے کہ ایکسپائری مدت بھی گزر چکی ہے۔ اب میرا کیانی پن واپس نہیں موڑا جا سکتا۔

میرا کیانی ہونا میری پیدائش کی وجہ سے ہے۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا ایمان ہے کہ ہم سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے چنانچہ یہ فدوی کسی بھی طور اقبال کی طرح شکوہ و جواب شکوہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ خدا کا شکر ہی ادا کر سکتا ہوں کہ اُس نے مجھے کیانی پیدا کیا ہے۔ وہ اگر زرداریوں کے گھر بھی پیدا کر دیتا تو پھر بھی میں کیا کر سکتا تھا۔ ویسے کیانی ہوتا زرداری

ہونے سے تو خاصا بہتر ہے۔ اگرچہ ایک وقت تھا کہ کیانی (جنرل) اور زرداری (صدر) دونوں اقتدار کی غلام گردش میں موجود تھے اور اُس وقت ہر اکھاڑ پچھاڑ کا محور جانے جاتے تھے لیکن کبھی کیانی کا لطیفہ نہیں سنا گیا لیکن شریفوں اور زرداریوں/ بھٹو پر اس قدر لطیفے گھڑے جا چکے ہیں کہ کیا ہی سکھوں اور پٹھانوں پر گھڑے گئے ہوں گے۔ اگر اس قدر لطیفے سکھوں یا پٹھانوں پر تراشے جاتے تو دونوں مارے غیرت کے بالترتیب جمنا دل اور دریائے کابل میں چھلانگ لگا چکے ہوتے۔ تاہم سکھوں اور پٹھانوں کو ذاتی طور پر آصف زرداری مع جاتی امراء مارکہ شریفوں کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اُس کی وجہ سے طنز کے تیروں کا رخ اُن سے ہٹ گیا ہے بلکہ اب تو اُن کے کھاتوں سے بھی کئی لطیفے نکال کر زرداری و شریفانِ جاتی امراء کے ذاتی اکاؤنٹ میں ڈیپازٹ کر دئے گئے ہیں، جیسے انہوں نے قوم کے مال کو اپنے باپ کا مال سمجھ کر اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں ڈیپازٹ کر دیا تھا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

جیسے میں اپنے کیانی ہونے پر شرماتا ہوں ویسے ہی دوسرے کیانی بھی اس بات پر شرمسار ہیں کہ میں بھی کیانی ہوں۔ اُن کی شرمساری بالکل بجا ہے کیونکہ مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں پائی جاتی جو کسی کے کیانی ہونے کی بین نشانی سمجھی جاتی ہے۔

کیانیوں کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ بندے کے پتر نہیں ہیں اور جو نہیں ایسا سمجھتے ہیں انہیں وہ پُتر بنا دیتے ہیں۔ پتر بنانا ایک پوٹھوہاری روزمرہ ہے جس کا مطلب ہے مزہ چکھانا۔ کیانیوں کو اس کام میں ملکہ حاصل ہے۔ بسا اوقات تو میرے جیسے کیانی میں بھی خون جوش مارنے لگتا ہے کہ کسی کو مزا چکھا دوں لیکن اکثر میں یہ مزا خود ہی چکھ کر نچلا بیٹھ جاتا ہوں۔

کیانی فطرتاً جھگڑالو ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ پاک فوج میں ان کی اکثریت نظر آتی ہے۔ یہ لڑائی کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ میرے دوست مرزا طاہر شریف بیگ ولد مرزا شریف بیگ کا کہنا ہے کہ جس طرح چرند پرند صبح سویرے روزی کی تلاش میں نکلتے ہیں اسی طرح کیانی بھی نہار منہ گھر سے کسی ایسے بندے کی تلاش میں نکلتے ہیں جو اُن سے لڑائی پر آمادہ ہو سکے۔ گرمیوں کے موسم میں تو اُن کی یہ جستجو ثمر آور ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس موسم میں تو ہر بندہ کیانی بنا ہوا ہوتا ہے تاہم سردیوں کے موسم میں ایسے بندوں کا خاصا کال ہوتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت شیخ بنی ہوئی ہوتی ہے اس لئے اُسے مطلوبہ بندوں کی سپلائی نہیں ہو پاتی چنانچہ اپنی عادت پوری کرنے کے لئے وہ اپنے ہی منہ پر طمانچہ جھاڑ دیتا ہے اور پھر اپنے آپ سے ہی نبرد آزما ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ آخری حد ہوتی ہے۔ گھر میں اُن کی بیگم تو ہوتی ہی ہے اور یہ خاتون خود بھی اچھی خاصی کیانی ہوتی ہے اس لئے کیانیوں کو خود سے لڑنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

میں نے مندرجہ بالا پیرے میں اپنے دوست طاہر کا تذکرہ کیا ہے اور ان کا پورا نام بمع ولدیت لکھ دیا ہے جو کہ اچھی خاصی خلاف ضابطہ حرکت ہے۔ میدان ظرافت کے موجودہ سرخیل ڈاکٹر محمد یونس بٹ اپنے دوست کے لئے ف۔ م۔ کا نام استعمال کرتے رہے ہیں اُن کی دیکھا دیکھی دوسرے لال بجھکڑوں نے بھی حروف تہجی پر چھاپے مارنے شروع کر دئے ہیں اور لگ بھگ سب کے سب استعمال کر ڈالے۔ اب راقم الحروف کے پاس کوئی حرف نہیں بچا ہے، چنانچہ وہ اپنے دوست کے ضمن میں پورا نام استعمال کر رہا ہے۔ بلکہ فدوی چونکہ کیانی بھی ہے اس لئے کسی کی پردہ داری کا بھی قائل نہیں چنانچہ اگر کسی کو متذکرہ دوست کے مزید کوائف درکار ہوئے تو وہ بھی اضافی مندرجات کے ساتھ بخوشی فراہم کر دئے جائیں گے۔

کیانی جس طرح خود ٹیڑھی کھیر ہیں اسی طرح اُن کے گھر میں جو چھوٹی چھوٹی ٹیڑھی کھیر کی رکابیاں ہیں وہ بھی کچھ کم کیانی نہیں ہیں۔ اگر کبھی آپ کا جانا اپنے برخوردار کے اسکول میں ہو اور کسی جگہ اسکول کے بچوں کا جمگھٹا دیکھیں تو پریشان مت ہوئیے گا۔ سمجھ جائیے گا کہ وہاں

ضرور کوئی کیانی زادہ کسی دوسرے ہم منصب کیانی زادے یا غیر کیانی سے گتھم گتھا ہوگا۔

ویسے کیانیوں کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی بہت فکر ہوتی ہے چنانچہ تمام کیانیوں کے گھروں میں کیبل کی تار دندناتی پھر رہی ہے۔ گھروں میں کیانی اپنی نومیدہ آفتوں کو ریسلنگ کے چینل دکھاتے پھر رہے ہوتے ہیں تا کہ اُن کے جنگجو سپوت ابتدائے آفرنیش سے ہی ٹریننگ حاصل کر سکیں تا کہ اُن کی آنے والی پیشہ ورانہ اور معاشرتی زندگی کی بروقت اور خاطر خواہ تربیت ہو۔

میرے دوست کا کہنا ہے کہ کیانی بہت جھوٹے ہوتے ہیں۔ مجھے ثبوت کے طور پر وہ سیٹلائٹ ٹاؤن میں ایک گھر کے سامنے لے گیا اور گیٹ پر لگی ہوئی نیم پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔۔۔"اسے دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں"۔۔۔میں نے منہ بنا کر کہا۔۔۔"کیا ہے اس میں؟"

"نیم پلیٹ پر لکھا ہوا ہے واحد کیانی۔۔۔۔۔ڈو وِیو بیلیو اٹ (would you believe it) کہ اس گھر میں چار بھائی رہتے ہیں اور چاروں کے چاروں کیانی ہیں۔ ان کے والد نے جھوٹی نیم پلیٹ لگوا رکھی ہے کہ وہ واحد کیانی ہے۔"

علامہ اقبال نے کہیں کہا تھا کہ ۔

وہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ہمارے اور آپ کے بڑے کیانی صاحب (سابقہ جرنل) نے اس شعر کی ماہیت کو جانچا اور دربار پر ایسے ایسے سجدے کھڑکائے ہیں کہ زرداریوں اور گیلانیوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کی مدت ملازمت میں تین برسوں کی توسیع کرنی پڑی۔ سب لوگ اُس در جاناں سے آشنا ہیں جہاں سے اُن کے سیلوٹوں کی آوازیں آیا کرتی ہیں۔ اور یہ امر بھی اظہر من الشمس ہے کہ اس نوٹیفکیشن کے اجرا میں اُن کی لیاقت اور قابلیت کا کتنا عمل دخل ہے۔ یہی وہ قابلیت ہے جو ہر جگہ کیانیوں کو مرکز نگاہ بنائے رکھتی ہیں اور یہی وہ لیاقت ہے جس سے یہ عاجز بے بہرہ ہے اسی لئے حالات کی سیخوں پر پڑا اسٹر رہا ہے۔

تو صاحبو! مندرجہ بالا باتوں کے باوجود میں بہانگِ دہل اس جرم کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں بھی کیانی ہوں۔

آخر کو میں کیانی ہی ہوں۔

یادوں کے دریچے

از:
عالیہ بٹ

یادیں! بہت سی یادیں! یادیں ہی یادیں! کاش یادیں بھی بکنے کی چیزیں ہوتیں، جنہیں ہم بیچ سکتے، خاص طور پہ بری یادوں کو تو پاس بھی نہ پھٹکنے دیتے مگر بری یادوں کے بھی بھلا خریدار ہوں گے؟

میں اچھی یادوں کو آگے بیچ دینے کی قائل ہوں اور بری یادوں کو ہمیشہ سنبھال کے رکھتی ہوں کیونکہ انسان کی اصل مضبوطی کا سبب اس کی راہ کی ٹھوکریں ہوتی ہیں، جن سے وہ گر گر کے سنبھلتا، مضبوط ہوتا اور بہت کچھ سیکھتا ہے، کیا خیال ہے ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں یا صرف فلسفہ جھاڑ رہی ہوں؟؟ تو جناب میرے فلسفی ہونے پہ مذاق تو نہیں اڑائیں ناں۔۔۔ایک دلچسپ بات بتاتی ہوں جو آج تک کسی کو نہیں بتائی، جب میں ایف۔ اے کر رہی تھی تو میرا ایک مضمون "فلاسفی" بھی تھا۔ جب ہمارا افلاسفی کا پریڈ ہوتا تو ایک کلاس لینے کے بعد دوسری کلاس کے لیے ساری لڑکیاں دوڑ لگا دیتی تھیں کیونکہ ہمارا کالج کوئٹہ کا سب سے بڑا گرلز کالج تھا جس کی ایک کلاس کا فاصلہ ہی اتنا زیادہ ہوتا

تھا کہ اکثر کلاس تک پہنچ کے یا ہم ہانپ رہی ہوتی تھیں یا ہماری لیکچرار جی اور خاص طور پہ فلاسفی کی کلاس میں ہی مجھے اتنی نیند آ رہی ہوتی تھی، کیا مزے کے نیند کے جھونکے ہوا کرتے تھے، اکثر خدیجہ مجھے اپنی کہنی مار کے جھونکوں سے نکالنے کی کوشش کرتی تھی۔۔۔(ہنسی)
سب سے دلچسپ بات یہ کہ کسی سے مشورہ لیے بغیر اور جھک مارنے کے لیے فلاسفی جیسا مضمون لیا۔ہم دونوں مشکل سے ہی پاس ہوئیں تھیں، جس پیریڈ میں کبھی ہمیں اُونگھ آ رہی ہوتی تھی کبھی ہماری لیکچرار کو۔۔۔اس وقت تو ہم فلاسفی میں کوئی تیر نہیں مار پائیں مگر زندگی کے تجربات نے ضرور فلسفی بنا دیا۔

تو جناب! قصہ تو ابھی شروع ہونے کو ہے جی! کالج کے آخری سال ہم کالج کی طرف سے بلوچستان کے انتہائی پر فضا مقام زیارت گئے۔میں نے اور خدیجہ نے خاص طور پہ پکنک کے لیے ایک جیسے کپڑے سلوائے تھے اور یہ کپڑے میری دوستی پکی سہیلی شبانہ نے سی کے دیے تھے۔۔۔ماشاءاللہ! کیا کمال کے کپڑے سیتی ہے۔۔۔میری شادی کے تمام کپڑے بھی شبانہ نے ہی سلائی کیے تھے۔
چلیں جی! انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور آخر پکنک کا دن آ ہی گیا۔اپنے والدین کے بغیر زندگی کی پہلی پکنک جس میں ہم اکیلے گئے، یعنی اتنا لمبا سفر۔۔۔پورے آٹھ گھنٹے آنے جانے میں لگتے ہیں۔
ہماری بس پہاڑی راستے پہ مزے سے کچے پتھریلے راستے پہ ہچکولے کھاتے گزر رہی تھی، ہمارے پیچھے اور آگے بھی کالج کی بسیں تھیں، لڑکیاں اپنی ہی موج میں اونچی آواز میں گانے گا رہی تھیں ۔

زندگی اِک سفر ہے سہانہ   یہاں کل کیا ہو کس نے جانا

لگ بھگ چار گھنٹوں کے دلچسپ اور پُر لطف سفر کے بعد آخر ہم نہایت پُر فضا مقام زیارت پہنچ ہی گئے، پہاڑوں پہ سبزہ عجب روپ دھارے بیٹھا تھا، پہاڑوں پر بنی پگڈنڈیاں، ان کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہی تھیں اور ان سے بہتے چشموں نے چار چاند لگا دیے تھے۔۔۔قدرت کے نظاروں کو دیکھ کے دل بہت سرشار تھا۔۔۔ہم نے درختوں، پہاڑوں اور چشموں کو کیمرے کی آنکھ میں قید کر



لیا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو بھوکی پیاسی لڑکیاں بریانی اور کبابوں پہ ایسے ٹوٹ پڑی تھیں جیسے زندگی میں اوّل و آخر بار کھانا میسر ہو رہا ہو۔۔۔ (ہنسی کا فوارہ)

آخر میں ہم "قائدِاعظم محمد علیؒ جناح" کی آخری آرام گاہ "ریزی ڈینسی" بھی گئے، جہاں ایسے لگ رہا تھا، کہ "قائدِاعظم جی" ابھی واپس آنے والے ہیں۔۔۔ اُن کا سامان بہت طریقے، سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے تو نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں واپسی کے لیے روانہ ہونا پڑا۔۔۔ واپسی پہ بارش شروع ہوگئی، موسم اور بھی خوشگوار ہوگیا تھا۔ بارش میں ذرا تیزی ہوئی تو خوشی اور سرشاری کی جگہ گھبراہٹ نے گھیر لی، ہم سب نے دعائیں شروع کر دیں کہ خیر و عافیت سے اپنے اپنے گھروں کو پہنچیں۔

ابھی ایک گھنٹے کا سفر باقی تھا کہ اچانک ہماری بس نے بریک لگایا، کسی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایک دم سے بس کیوں رک گئی۔ آگے اور بھی گاڑیاں ناراض کھڑی تھیں، آخر پتا چل ہی گیا کہ پُل ٹوٹنے کی وجہ سے کوئٹہ جانے کا راستہ ہی بند ہے۔

اب تو نازک اندام اور بزدل لڑکیوں نے رونا ہی شروع کر دیا۔ پورے چار گھنٹے ہم انتظار کی اذیت سے گزرے کہ کب روانہ ہوں گے؟؟ اللہ اللہ کر کے سب کی دعائیں رنگ لے ہی آئیں اور بس ایک اور متبادل رستے پہ رواں دواں ہوگئی۔۔۔ رات کو ایک بجے ہم کالج کے گیٹ کے سامنے تھے۔

کالج کے باہر سب کے پریشان حال والدین کا ایک ہجوم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آخر بخیر و عافیت ہمیں گھر پہنچا ہی دیا تھا۔ (الحمد اللہ) اور ہمارے بڑے دل والے والدین نے ہلکی سی بھی ڈانٹ نہیں پلائی ورنہ ہم خیر کی امید نہیں لگائے ہوئے تھے۔۔۔ امی ابو نے تو کچھ نہیں کہا مگر پہاڑوں پہ چڑھنے اترنے کی وجہ سے ٹانگوں کی "کھلیاں" آج بھی یاد ہیں کہ ہم پورے چار دن تک درد سے کراہتے رہے تھے۔

علامہ اقبال تمام عمر اسلام کی شان اور مسلمانوں کے بارے میں شاعری کرتے رہے، لیکن اسلامی رواج کے مطابق داڑھی نہیں رکھتے تھے۔ ایک مولانا اپنے ایک مقدمے میں مشورے کے لئے اُن کے پاس آتے رہتے تھے۔ وہ اپنی بہن کو جائداد کے حق سے محروم کرنا چاہتے تھے علامہ کو اُس مقدمہ میں کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن مولانا پھر بھی کسی نہ کسی سلسلے میں مشورہ کے لئے آدھمکتے اور ساتھ ہی اقبال کو نصیحت بھی کرتے رہتے کہ مسلمان ہونے کے ناطے اُنھیں کیا کیا فرائض انجام دینے چاہئیں۔ ایک دِن بولے کہ آپ عالمِ دین ہیں اور شریعت کے حامی لیکن آپ داڑھی نہیں رکھتے جو اسلامی شعار ہے۔ علامہ اِن روز روز کی نصیحتوں سے تنگ آکر بولے "مولانا۔۔۔ آپ کی تلقین کا مجھ پر بہت اچھا اثر ہوا ہے۔ اور میں نے عہد کیا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک معاہدہ کروں۔ یہ بجا ہے کہ کسی مسلمان کے منہ پر داڑھی کا نہ ہونا بہت غلط ہے، لیکن اسلام کے مطابق بہن کو وراثت سے محروم کرنا بھی تو شریعت کے خلاف ہے۔ لائیے ہاتھ۔۔۔ میں داڑھی بڑھا لیتا ہوں، آپ اپنی بہن کو وراثت میں سے حصہ دے دیجئے۔"



اس پیشکش پر نہ تو مولانا کا ہاتھ آگے بڑھا، نہ علامہ اقبال کی داڑھی ہی بڑھی۔

تنویر پھول

برق کی بے حد کمی ہے، کیا کہوں!
موم بتی جل رہی ہے، کیا کہوں!

کیا کہا؟ وہ قوم کا ہمدرد ہے!
اپنا لیڈر لالچی ہے، کیا کہوں!

کہہ رہے تھے کل جو خود کو خر نواز
لات اُن کو بھی پڑی ہے کیا کہوں

گوشت کھانا ہو تو بن جنگل کا شیر
دال بھی مہنگی ہوئی ہے، کیا کہوں!

ہے یہ افریقہ میں لیکن دوستو!
مصر، مصری کی ڈلی ہے، کیا کہوں!

ایک ذرہ یاں نظر آتا نہیں!
چین میں چینی ملی ہے، کیا کہوں!

شہر کی کیسے صفائی وہ کریں!
مچھروں سے دوستی ہے، کیا کہوں!

ان کو گلیوں سے مہک آتی نہیں!
ناک اونچی ہو گئی ہے، کیا کہوں!

کوئی بھی لیڈر نہیں پرسانِ حال!
قوم کی حالت بری ہے، کیا کہوں!

ٹکڑے ٹکڑے ہے سیاسی اتحاد
دال جوتی میں بٹی ہے، کیا کہوں!

اُسترا مہنگائی کا سر پر چلا!!
قوم گنجی ہو چکی ہے، کیا کہوں!

کر گیا چٹ یار ہے مرغی کی ران
صرف ہڈی ہی بچی ہے، کیا کہوں

شاید آ جائے اب اس میں کچھ اُبال
پھول جی! باسی کڑھی ہے، کیا کہوں!

تنویر پھول

دیکھ کر دل میں لڈو گے پھوٹنے، جب وہ آئے تو پوری غزل ہو گئی
ہم کو دیکھا رقیبانِ محفل نے بھی، سٹپٹائے تو پوری غزل ہو گئی

اپنی مونچھوں پہ وہ تاؤ دینے لگے، ہم بھی قینچی لئے اُن کی جانب چلے
نصف مونچھیں کٹیں ایک ہی وار میں، بڑبڑائے تو پوری غزل ہو گئی

اسپ شیرازی ہیں شاعرِ بے بدل، ہر گھڑی آپ کرتے ہیں فکرِ سخن
گھاس کھاتے رہے، دُم ہلاتے رہے، ہنہنائے تو پوری غزل ہو گئی

اُن کی باتوں کا انداز کیا تھا عجب، منہ سے اُن کے نکلنے لگیں سیٹیاں
ساتھ اُن کا نہیں دے رہی تھی زباں، منمنائے تو پوری غزل ہو گئی

اپنے ہونٹوں کو وہ سرخ کرنے لگے، پان منہ میں دبائے ہوئے آ گئے
آنکھ جھپکا کے کہنے لگے جانے کیا، مسکرائے تو پوری غزل ہو گئی

دِل کے گوشے میں ہے یاد اُن کی بسی کتنی اچھی تھی وہ رات برسات کی
آ رہے تھے ہمیں مارنے کے لئے، لڑکھڑائے تو پوری غزل ہو گئی

کیسا پُر لطف منظر تھا وہ دوستو! سُن رہے تھے کبھی طائرانِ چمن
پھول صاحب تھے ڈالی پر رطب اللساں، گل کھلائے تو پوری غزل ہو گئی

سیاسی بیان



میں نے اُس سے کہا کہ جانِ من!
جان تم پر نثار کرتا ہوں
جتنے تارے ہیں آسمانوں پر
تم سے اُتنا میں پیار کرتا ہوں
میں نے اس سے کہا" کنوارہ ہوں
ایک ذاتی مکان ہے میرا"

اُس نے کچھ دیر غور سے دیکھا
زیرِ لب مسکرائی اور کہا
"ایک بیوی ہے پانچ بچے ہیں
پھر بھی کیسا گمان ہے تیرا
پہلی بیوی بھی خوش نہیں تجھ سے
دوسری پر دھیان ہے تیرا
یہ تیری عرضداشت عشق نہیں
یہ "سیاسی بیان" ہے تیرا"

سعید رضا

ملک اسلم ہمشیرا
اوچشریف۔اوچ شریف



لالچ بُری بلا ہے

ایک دفعہ کا ذکر ہے بلکہ کئی دفعہ کا ذکر ہے بلکہ ہر دفعہ کا ذکر ہے بلکہ آج صبح ہی کا ذکر ہے کہ میری اذان فجر کے وقت ہی جاگ ہوگئی۔۔۔۔نماز فجر پڑھی اور سچ کہہ رہا ہوں واقعی پڑھی اگر نہیں مانتے تو نہ مانیں مگر میں نے نماز پڑھی تھی۔۔۔۔اور پھر سوگیا۔۔۔۔۔

یہ تو بھلا ہو بشیرے دودھ والے کا جس نے آٹھ بج کر ۲۰ منٹ پر دروازے پر نقارہ خوانی شروع کردی۔۔۔چنانچہ عالم بے خودی میں لہراتے اور انگڑائیاں لیتے دروازے کی طرف دوڑا۔۔۔دودھ لے کر کچن میں رکھا، موبائیل کا درشن فرمایا تو ٹائم دیکھتے ہی دماغ کے چودہ بلکہ پندرہ سولہ طبق روشن ہوگئے، سکول لگنے میں صرف پانچ منٹ رہتے تھے چنانچہ اِس قلیل وقت میں ذلیل ہونا تو بنتا ہی تھا۔

آپ سبھی حضرات کو تو میرا پتہ ہی ہے کہ میں کتنا ذہین، چالاک وعیار اور دور اندیش واقع ہوا ہوں؟ چنانچہ بیوی کو جگانے کا خطرہ مول لیے بغیر ہی الماری سے کپڑے نکالے اور صرف اُنہی جگہوں پر استری پھیرنا شروع کردی جو جڑسے باہر نظر آنے تھے، یعنی شلوار کے پائنچے اور قمیص کا دامن باقی اللہ اللہ، خیر صلا۔

اب شلوار میں ازار بند ڈالنے کا خوفناک مرحلہ درپیش تھا کیونکہ جب بھی میں نے پنسل سے ناڑا ڈالنے کا مشن اپنے سر لیا بال پین کی ٹوپی نے درمیان میں جا کر بال پین کا ساتھ چھوڑ دیا اور اب کیپ کو باہر نکالنا بھی دِلی کا لال قلعہ فتح کرنے کے مترادف تھا۔

یہاں پر بھی میری ''سیانڑ پتری'' کام آئی اور ٹوپی قلم کو اس کے حال میں چھوڑ کر پینسل کی نِب کو کام میں لاتے ہوئے ازار بند کو دوسرے نیفے سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ بقول شاعر:

قلم دو چار ایسے ہی لگا لیتا ہوں جیبوں میں
مرے احباب میں اِس سے مری توقیر بڑھتی ہے
کبھی لکھنے لکھانے کی تو نوبت ہی نہیں آئی
میں ناڑا ڈال لیتا ہوں، ضرورت جب بھی پڑتی ہے

اب مرحلہ تھا ناشتہ کرنے کا۔۔۔تو اس سے پہلے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ جو گرز سے دو دو ہاتھ کر لئے جائیں۔۔۔مگر اس سے بھی پہلے مختلف جرابوں کو سونگھ کر اُن کا لیبارٹری ٹیسٹ کیا کہ آیا اِن میں سے کوئی جُراب ایک آج کا دِن نکال سکتی ہے؟ یا پھر مجھے گھر سے نکال سکتی ہے؟

چنانچہ اُن میں سے ایک برنگ سیاہ جُراب کو جیسے ہی ناک سے لگایا اس کے اندر نامعلوم مدت سے بسی مُشکِ کستوری نے ناشتے کی طلب کو رفو کردیا۔

اب آٹھ بج کر ۲۰ منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے جلدی میں منہ پر پانی کے دو تین طمانچے رسید کیے اور سکول چمپت ہوگیا۔

راستے میں ماسٹر شبیر شاہ کو دیکھا جو بڑے سکون سے مثلِ سگِ آوارہ پاپڑوں والی بند دکان کے آگے بیٹھا دکان کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے کہا "اوکاکے! آ دیار! سکول کو دیر ہو رہی ہے!!"

تو جناب نے وہ تاریخی جواب دیا جس نے مجھے یہ تحریر لکھنے پر مجبور کیا وہ تاریخی الفاظ یہ تھے "ونج ونج کم کر۔۔۔"

چنانچہ عزت افزائی کا ٹوکرا سر پر رکھے اپنے مشینی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ۹ بجنے سے ۵ منٹ پہلے میں سکول پہنچ گیا۔

حاضری لگانے کے بعد میرے اندر بھی اب مولاجٹ اور نوری نت والی انتقامی روح بیدار ہونے لگی۔ فوراً اولمدرس کو جا کر آگاہ کیا کہ باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ ایم۔ ای۔ اے مثلِ سیلابی ریلا سکول سے چند سو گز کے فاصلے پر پہنچ چکا ہے لہٰذا حفاظتی بندھ باندھ لیں۔

توقع کے عین مطابق ہیڈ ماسٹر نے فوراً شبیر شاہ کو کال ملائی اور ہنگامی بنیادوں پر سکول پہنچنے کے آدیش جاری کر دیے۔

اس کے بعد میں نے بلال چپراسی کو چھڑکاؤ کے بہانے راستے پر پانی سے پھسلن بنوادی تاکہ مدرسِ مذکورہ کا شایانِ شان استقبال کیا جاسکے، چنانچہ یہ گانا گنگناتے ہوئے شبیر شاہ کا انتظار کرنے لگا۔

چاہت میں کیا دنیاداری، جنگ میں کیسی مجبوری
کچی مٹی تو مہکے گی ہے مٹی کی اپنی مجبوری

۹ بج کر ۲۵ منٹ ہو چکے تھے۔ اچانک دُور اُفق سے گرد اُڑتی دکھائی دی۔ لگ بھگ ایک منٹ بعد حضرت شبیر شاہ کا ظہور ہونے لگا۔ پرانے سی ڈی موٹر سائیکل پر پاپڑوں سے لدے پھندے، کسی توڑی کی ٹرالی کی طرح سکول نازل ہو چکے تھے۔ مگر جیسے ہی حضرت شبیر شاہ صاحب کا میری بچھائی ہوئی بارودی سرنگ "دھپھسلن" سے گزر ہوا تو توقع کے عین مطابق موصوف گھڑام سے زمین بوس ہو گئے اور چشمِ فلک نے وہ منظر بھی دیکھا کہ .... کے ہزاری منصب پہ براجمان مدرسِ مذکور "وٹ" کھا کر گرا اور ایک منٹ کے اندر اندر "ترگھٹ" والے پاپڑوں کی قبر میں دفن ہو چکا تھا۔

دھماکہ اتنے زور کا تھا کہ تمام مدرسین موقع پر پہنچ گئے اور رضاکارانہ طور پر ریسکیو کرنے لگے، میں بھی خالص مگرمچھ کے آنسوؤں کی آمیزش آنکھوں میں سجائے فوراً موصوف کو نیچے سے برآمد کرنے میں لگ گیا، پھر بھی میرا مقصد جناب کو اُٹھانے سے زیادہ پاپڑ لتاڑنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ماسٹر صاحب تو صحیح سالم نکل آئے مگر اب بھی کریلے پاپڑ کے ٹکڑے مونچھوں اور سر کے بالوں میں اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

اب حالات سازگار ہوئے تو تمام ریاضی کے مدرسین کو بلایا گیا تاکہ نقصان کا تخمینہ لگایا جاسکے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق سولہ سو کے پاپڑ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے رضائے الٰہی سے وفات پا چکے تھے، کچھ جاں کنی کے عالم میں تھے، جو پاپڑ شاہ صاحب کے زیرِ سایہ آ گئے تھے وہ تو صفحۂ ہستی سے ہی مٹ چکے تھے، چنانچہ شاہ صاحب نے میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بقیہ ٹوٹے ہوئے پاپڑ نرسری کے بچوں میں تقسیم کرا دیے۔

تھوڑی دیر بعد نرسری کے بچے پاپڑ بھی کھا رہے تھے اور خلوصِ دل سے دعا بھی مانگ رہے تھے کہ اے اللہ! روز روز ایسے حادثات کے اسباب پیدا فرما!!

میری اس پوسٹ کا مقصد نہ کسی معزز استاد کی دل آزاری ہے اور نہ کسی کی روزی پہ "لت" مارنا بلکہ ایسی لت چھڑوانا ہے تاکہ وہ تمام مدرسین جو اپنی بھاری تنخواہ اور مرتبے کو بالائے طاق رکھ کر بچوں میں پاپڑ جیسی گھٹیا چیزیں بیچ کر پیٹرول باھر سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس گھٹیا تجارت سے توبہ تائب ہو جائیں۔

نتیجہ: لالچ بری بلا ہے

محمد اشفاق ایاز
جلالپور جٹاں

قبلہ جیدا پہاڑیا

صحن سے ملحق برآمدے میں ٹھنڈے فرش پر دری بچھائے بیگم صاحبہ دوپہر کی ہنڈیا کے لئے آلو چھیل رہی تھی۔ آج اس گھر میں آلو والا سالن تیار ہوتے چوتھا روز تھا۔ یعنی ہنڈیا میں کسی نہ کسی شکل میں آلو ضرور ڈالے جاتے۔ کیونکہ اس وقت بازار میں آلو سب سے سستے تھے۔ پہلے روز آلو کی بھجیا، دوسرے روز آلو مع شملہ مرچیں، تیسرے روز آلو پالک اور آج چوتھے روز آلو دال کی تیاری ہو رہی تھی۔ ہنڈیا کا اصل جزو آلو ہوتے جو مقدار میں زیادہ ہوتے باقی دوسری چیزیں صرف ذائقہ بدلنے کے لئے شامل کی جا رہی تھی۔



آلو ڈش کے تسلسل کے پس منظر میں جیدا پہاڑیا کا فلسفۂ قربانی کارفرما تھا۔ جس کی بنیاد یہ تھی کہ چند دن پیشتر جیدے اور ان کی بیگم کے درمیان بند کمرے میں ہونے والے مذکرات میں اس بات پر بھی اتفاق ہوا تھا کہ عید قربان میں تو صرف تیس دن رہ گئے ہیں۔ اور عید پر کہیں نہ کہیں سے اتنا گوشت تو آ ہی جاتا ہے۔ جس سے اگلے ایک ڈیڑھ ماہ آسانی سے نکل جاتے ہیں۔ پھر کیوں نہ ان تیس دنوں میں بازاری گوشت کی خریداری سے اجتناب کیا جائے۔ بیگم کے پاس کبھی بھی جیدے پہاڑیے کی کسی بات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا۔ اس بار بھی اس نے اپنے شوہر نامدار کے منصوبے پر گردن جھکا کر تصدیقی مہر ثبت کر دی۔ بس پھر کیا تھا دوسرے ہی روز وہ سبزی منڈی سے اپنے ایک آڑھتی دوست سے پورے دو تھیلے آلو مانگ لائے تھے۔ تاکہ آلو ڈشوں کی تیاری میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

یہ منظر میرے دفتر کے ساتھی جاوید کے گھر کا تھا۔ وہ جاوید سے جیدا پہاڑیا کیوں مشہور ہوا حالانکہ اس کے آباؤ اجداد کا تعلق بھی پہاڑوں سے نہیں تھا۔ مگر وہ سارے دفتر اور گرد و نواح میں جیدا پہاڑیا کے نام سے ہی مشہور تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ جب بھی دفتر آتا تو زور سے کہتا ”جیدا اُتر پہاڑوں آیا“۔ یہ گویا اس کی طرف سے دفتر آنے کا کھلم کھلا اعلان ہوتا تھا۔ وہیں سے وہ جیدا پہاڑیا کہلایا جانے لگا۔ شکل سے معصوم اور بے ضرر نظر آنے والا جیدا پہاڑیا اتنا معصوم بھی نہیں تھا۔ وہ کردار میں بھی پہاڑیا تھا۔ جو بات کہتا اس پر پہاڑ کی طرح جم جاتا۔ پھر چاہے وہ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیئے ایک جھوٹ بولے یا ایک ہزار، دوسرے فریق کو اس کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی پڑتے تھے۔

ہر وقت اور ہر لمحہ دیہاڑی لگانے کے چکر میں شکار کی تلاش میں سرگرداں، اور زبان ایسی کہ اس کا شکار خود بخود اس کے جالے میں پھنستا چلا جاتا۔ وہ ان لوگوں سے بھی پیسے نکلوا لیتا جن کا کوئی کام نہ ہوتا یا اس کے متعلقہ کام نہ ہوتا۔ مکڑی کے جالے میں پھنسی

مکھی کی طرح اس کے وعدوں کے ہیر پھیر میں آیا ہوا بندہ خود ہی چکر لگا لگا کر تھک کر توبہ کر لیتا۔

بیگم جیدا پہاڑیا جس دری پر بیٹھ کر آلوؤں کی کھال اتار رہی تھیں۔اس پر رنگ دار چادر بھی بچھائی ہوئی تھی۔جس سے دری چھپ سی گئی تھی۔اس دری کی بھی عجب کہانی تھی۔یہ نہ تو جیدے پہاڑیے نے خریدی تھی اور نہ ہی اس کی بیگم اپنے ساتھ جہیز میں لے کر آئی تھی۔ہوا یوں کہ دو سال قبل پندرھویں روزے افطار کے وقت گلی میں محلے کے ایک بزرگ کی رسم قل کا ختم تھا۔ افطاری اور کھانے کے بعد جب قناتیں، دریاں اور برتن سمیٹے جانے لگے۔جیدا پہاڑیا پوری تندہی سے محلے داروں کی مدد کر رہا تھا۔اسی دوران اچانک بجلی چلی گئی۔جیدا پہاڑیا شاید اسی انتظار میں تھا۔اس نے دو تین دریاں پہلے ہی تہہ کر کے اپنے گھر کے دروازے کے قریب رکھ دی ہوئی تھیں۔گھر کا دروازہ کھلا رکھا گیا تھا۔جونہی بجلی بند ہوئی۔اس نے بڑی تیزی سے ہاتھ چلایا، ایک دری جو اچھی حالت میں تھی، اسے اٹھایا اور دروازے سے اپنے گھر کے اندر پھینک دی۔اس کی بیگم شاید پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ اس نے جلدی سے دری کو گھسیٹا اور کچن کے ساتھ سٹور روم کے کونے میں رکھ دیا۔اُدھر جیدا پہاڑیا اندھیرے میں اپنے دروازے سے دور چلا گیا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔

محلے داروں کی چیزیں ادھر اُدھر کرنے کا یہ پہلا واقعہ نہیں تھا ۔شادی یا دیگر تقریبات کے موقع پر گلی میں بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک دو کھسکا لینا، ایک دو گلاس، پرات، جگ، پلیٹ وغیرہ کو بحفاظت اپنے گھر کے گوشہ عافیت میں پہنچانا اس کے دونوں ہاتھوں اور دونوں ٹانگوں کے ساتھ اس کے سازشی و فتوری دماغ کا معمولی کھیل تھا۔حیرت ناک بات یہ تھی کہ کسی کو اس پر شک بھی نہیں ہوتا تھا۔کیونکہ یہ ہمسائیگی یا محلے داری کا حق ادا کرتے ہوئے انتظامات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔

ادھر کم بخت لائٹ جلدی آ گئی۔اب بھلا جیدے پہاڑیے پر شک کون کرے۔وہ تو لائٹ آنے تک دور ایک کونے میں کھڑا تھا۔جب سامان کی واپسی کے لیئے اسے لوڈر پر لادنے لگے تو گنتی کے دوران ایک دری کم پائی گئی۔ایک شور سا اٹھا۔منتظمین ایک دوسرے کو غفلت پر مورد الزام ٹھہراتے اور اصل قصوروار دوسرے محلے کے نشئیوں کو ٹھہراتے ہوئے چلے گئے۔جس کا مطلب یہ تھا کہ اب دری پر بلا شرکت غیرے جیدے پہاڑیے اور اس کی بیگم کا اختیار تھا۔اڑوس پڑوس اور محلے والوں کی نظر بد سے بچانے کے لئے چند ماہ دری گھر کے پچھلے کمرے میں ویسی کی ویسی پڑی رہی۔جب ہر طرح کا خطرہ ٹل گیا تو گرمیوں میں صحن سے ملحق برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر بچھائی جانے لگی۔اسے مزید محفوظ بنانے کے لئے اس پر پرانی رضائی کی رنگ دار چادر ڈال دی جاتی۔

دفتر میں کوئی دن ایسا نہ جاتا جب جیدا پہاڑیا دیہاڑی لگائے بغیر گھر جاتا ہو۔ایسا لگتا تھا کہ اس نے پورے جسم پر شہد ملی ہوئی ہے۔کہ مکھیاں اڑ، اڑ کر اس سے چمٹ جاتی ہیں۔دوستوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا شاندار تھا۔ہنس مکھ تھا اور ہر بات کو ہنسی مذاق میں ٹال جاتا۔اسی لیئے کسی کو اس کی "خفیہ خانے" سرگرمیوں پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

ایک دفعہ ایک سیدھا سادھا سائل دور کے گاؤں سے اپنی درخواست کے سلسلے میں آ گیا۔اس نے اپنی درخواست ایک فائل میں لگا رکھی تھی۔جیدا پہاڑیا پتہ نہیں اسے کیسے گھیر گھار کر اپنے کمرے میں لے آیا۔بڑے غور سے فائل کا ملاحظہ کیا۔اور یہ کہہ کر فائل سائل کو واپس پر دی کہ اس میں سائل کا "ڈیتھ سرٹیفکیٹ " نہیں لگایا گیا۔سائل کو پہلی دفعہ معلوم ہو رہا تھا کہ اپنی درخواست کے ساتھ ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی لگایا جاتا ہے۔اسے بڑی شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔قریب تھا کہ اس غلطی پر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے اس نے ہمت کر کے اس کے حصول کے بارے میں پوچھ لیا۔

"جی وہ ڈیتھ سرٹیفیکیٹ کہاں سے بنوانا ہے"۔سائل نے سوال کیا۔

جیدے پہاڑیئے کو پتہ چل گیا کہ سائل کتنی عقل کا مالک ہے۔اس نے کہا:تم ایسا کرو اپنے ڈیتھ سرٹیفیکیٹ کی درخواست لکھو۔اپنے علاقے کے کونسلر سے مہر لگواؤ۔پھر سرکاری ہسپتال سے بنوا کر اپنے علاقے کی میونسپل کمیٹی میں جمع کروادو۔وہ ہمیں بھیج دیں گے۔آپ کا ڈیتھ سرٹیفیکیٹ ملتے ہی درخواست جمع ہو جائے گی۔

سائل اس پیچیدہ طریقہ کار سے پریشان ہوگیا۔اور پوچھنے لگا اس کا آسان طریقہ کیا ہے۔جیدے پہاڑیئے نے اسے اس بات پر قائل کر ہی لیا کہ اگر وہ اس کی فیس اسے جمع کروادے تو اپنے طور پر جلدی بنوا دے گا۔یوں سودا مناسب "ریٹ" پر طے ہو گیا۔سائل نے رقم اور فائل جیدے پہاڑیئے کے حوالے کی۔وہ اس اہم اور مشکل مسئلے کے آسان حل پر خوشی خوشی چلا گیا۔

ایک دفعہ ایک سائل آیا۔اس کی درخواست کے ساتھ ایک فارم بھی تھا جس پر اس کے دونوں ہاتھوں کی ایک ایک انگلی کے نشانات ثبت کرنا تھے۔جب جیدے پہاڑیئے کو معلوم ہوا کہ سائل آسانی سے دودھ دینے والی بھینس نہیں۔تو اس نے سفید کاغذات پر اس کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کی نشانات کے ساتھ اسے میز پر کھڑا کیا اور اس کے پاؤں کے نشانات بھی لئے۔سیاہی سے اس کے ہاتھ اور پاؤں کالے ہو چکے تھے۔جب سائل نے اعتراض کیا تو جیدے پہاڑیئے نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ گزشتہ ایک ماہ سے ہائی کورٹ کے حکم پر ہاتھوں اور پاؤں کے نشانات لئے جا رہے ہیں۔اور ان کی فیس بنک میں جمع کرائی جاتی ہے۔یوں سائل حسب منشا جیدا پہاڑیا خدمت کرتا ہوا چلا گیا۔

جیدے پہاڑیئے کو فلم دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔وہ ہر جمعہ اور منگل کو پہلا شو ضرور دیکھتا۔ایک دفعہ ایک فلم لگی جسے عادی فلم بینوں نے فلاپ قرار دے دیا تھا۔ جیدا پہاڑیا بھی اپنے ایک مقررہ دن فلم دیکھنے جانے لگا تو ایک دوست نے کہا کہ نہ جاؤ فلم فلاپ ہو چکی ہے۔



"یہی تو میں دیکھنے جا رہا ہوں کہ یہ فلم فلاپ کیسے ہوگئی"۔ جیدے پہاڑیئے کے اس فلسفے کا توڑ کسی کے پاس نہ تھا۔

ایک دن ہمارے ساتھی جمیل صاحب دفتر نہ آئے۔ اتفاق سے اسی دن جمیل صاحب کا ایک قریبی ساتھی ان سے ملنے آ گیا۔ جب اس نے جمیل صاحب کے بارے میں پوچھا تو جیدا پہاڑیا فوراً بول اٹھا:

"آپ کو پتہ نہیں جمیل صاحب ہسپتال میں داخل ہیں"۔

"کیوں کیا ہوا"۔ وہ صاحب بولے۔

"وہ سلوتری ہسپتال کی "سنڈا" وارڈ میں داخل ہیں۔ انہوں نے کل رات گندلاں دا ساگ کھا لیا تھا۔ جس سے انہیں گوبر آنے کی تکلیف ہوگئی تھی"۔ جیدے پہاڑیئے نے اس قدر سنجیدگی سے وضاحت کی کہ وہ صاحب مزید کچھ کہے سنے بغیر فوراً جمیل صاحب کی خیریت دریافت کرنے چلے گئے۔

ایک دن میں جیدے پہاڑیئے کے ساتھ دفتر کے ایک نوجوان ساتھی کی شادی پر چلا گیا۔ کھانا کھولا گیا تو وہ بڑی تیزی سے اٹھا۔ بڑی پلیٹ میں پہلے ایک سٹینڈ سے چاول ڈالے۔ پھر جگہ بدل کر دوسرے سٹینڈ سے گوشت کی بوٹیوں سے چاولوں پر پہاڑ بنا لیا۔ اس کے بعد سب سے آخر میں لگے سویٹ ڈش کے سٹینڈ سے کسٹرڈ کے تین چار بڑے چمچ ان بوٹیوں پر ڈال لیئے۔ اب سب کی نظریں جیدے پہاڑیئے پر اٹھ رہی تھیں۔ وہ کبھی ہال میں ایک طرف چکر لگاتا اور کبھی دوسری طرف۔ جب سارے ہال کا چکر لگا چکا تو واپس میرے قریب میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا: خدا کا خوف کرو۔ یہ کیا معجون مرکب تیار کی ہے۔ اس کا معصومانہ جواب تھا: پھر مجھے دیکھتا کون۔ یہ میرا بڑا پن نہیں تو اور کیا ہے کہ سب نظریں مجھے دیکھ رہی ہیں۔

کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ شادی سے پہلے اسے بھی ایک لڑکی سے "ایلو، ایلو" ہو گیا۔ لیکن اس سے حال دل کہنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ جیدے نے ایک کلائی پر اس لڑکی کا نام بھی کھدوا لیا تھا۔ جسے وہ اس لڑکی کو دکھا کر اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ جیدے پہاڑیئے کی بعض حرکتوں سے غالباً لڑکی کو بھی اس کا احساس ہو چکا تھا۔ ایک دن وہ دفتر آیا تو اس کی کلائی پر اس جگہ پٹی بندھی ہوئی تھی جہاں اس نے اس لڑکی کا نام کھدوا رکھا تھا۔ اس کی شکل پر تاثرات بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ ایک ساتھی نے ہمت کر کے پٹی اور چہرے کی بگڑی صورت حال کا پوچھ ہی لیا۔ پہلے تو وہ ہچکچایا۔ پھر اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے بولا :

"کل شام مجھے کہیں سے پتہ چلا کہ وہ لڑکی قریبی پارک میں موجود ہے۔ میں بھی پارک میں ٹہلنے کے بہانے وہاں پہنچ گیا۔ وہ لڑکی واقعی وہاں موجود تھی۔ میں موقع پا کر بڑے عاشقانہ انداز سے چلتا ہوا اس کے قریب گیا۔ اور اپنا منہ دوسری طرف کر کے لڑکی کے سامنے وہ کلائی کر دی جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ لڑکی اسکے لیئے پہلے سے تیار تھی۔ اس نے فوراً اپنے پرس سے راکھی نکالی اور میری کلائی پر باندھ دی۔ مجھے ایسے لگا جیسے اس لڑکی نے میری محبت اور قربانی کو قبول کرتے ہوئے اپنا خوشبو میں لپٹا ہوا رومال باندھ دیا ہو۔ خوشی سے نہال ہو کر جب میں نے اپنا منہ لڑکی کی طرف کر کے کلائی پر دیکھا تو وہاں رومال کی بجائے راکھی بندھی ہوئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ جب اس نے کہا "مجھے آپ جیسے بھائیوں پر فخر ہے" تو میں راکھی وہیں پھینک کر بھاگ آیا۔ میرے پیچھے اس لڑکی کے زور زور سے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے گھر آ کر اپنی کلائی پر تیزاب ڈال کر اس کا نام مٹا دیا۔۔ بس"۔

کمرے میں چند لمحے پراسرار خاموشی چھا گئی۔ جیدے پہاڑیئے کو یقین تھا کہ سب اس کا مذاق اڑائیں گے، لیکن کسی کے منہ ایک لفظ نہ نکلا۔ اور سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ایلو پیتھک حکیم

(نثری نظم)



ڈاکٹر عزیز فیصل

کسی حکیم نے
میلے سے چارٹ پر لکھ کر
مطب میں ایک جگہ کر دیا ہے آویزاں
میں وہ حکیم ہوں جو محض تھرمامیٹر سے
کولیسٹرول کے لیول کو ناپ لیتا ہوں

اور ایک عام
سٹیتھوسکوپ سے فوراً
لہو کے سرخ جیسے، سفید سیل سارے
اک ایک گن کے
بتاتا ہوں چند لمحوں میں

میں بی پی آلے کی کمزوری مدد لے کر
جگر کا موڈ
تقاضائے سینہ ومعدہ
ہر اک مریض کو موقعے پہ ہی بتاتا ہوں

گلے کے رنگ سے
آنکھوں کے گرد حلقوں سے
میں تولتا ہوں
کہ پتھری ہے کتنی گردوں میں

میں دیکھتا ہوں توجہ سے جب بھی
عورتوں کو
پلک جھپکتے ہی سی ٹی سکین کرتا ہوں
اور ان کی حالتِ طرفہ پہ بین کرتا ہوں

جواد حسن جواد

جھگڑے کی جو صلح و صفائی میں پڑ گیا
گھونسہ اُسے بھی ایک لڑائی میں پڑ گیا

کہنے لگے ہیں لوگ سبھی ڈاکٹر اسے
یوں نقص کوئی اُس کی لکھائی میں پڑ گیا

حلوائی جس کو کہتا تھا چھوٹی الائچی
مچھر تھا جو کہیں سے مٹھائی میں پڑ گیا

لیلیٰ کے گھر سے مجنوں کو جوتے ہوئے نصیب
کیسا خلل یہ آبلہ پائی میں پڑ گیا

آئے نہ شامِ وعدہ وہ کھاتے رہے اچار
یوں بھی معاملہ یہ کھٹائی میں پڑ گیا

اُس کو ملی نہ آگ بجھانے کی نوکری
آخر کو وہ لگائی بجھائی میں پڑ گیا

جوّاد نیند تو نہ اُڑی یادِ یار سے
وقفہ مگر ذرا سا جمائی میں پڑ گیا

جواد حسن جواد

یوں توند نکالے لب دریا وہ پڑا ہے
ہر شخص سمجھتا ہے کہ سوہنی کا گھڑا ہے

جی چاہے کوئی بھینس وہاں لا کے بٹھاؤں
خالی سا ترے گھر کے جو آگے کا تھڑا ہے

لگتی ہے کبھی یوں ترے چہرے پہ تری ناک
تربوز پہ جیسے کوئی انگور پڑا ہے

ہکلانے کی عادت ہے کہ آداب تکلم
سو بار زباں پر ترا نام آ کے اڑا ہے

دیتا ہے بہت حسن تناسب پہ دلائل
خود عرض میں جو طول سے دو ہاتھ بڑا ہے

اِس واسطے اپنائی ہے اب اُس نے شرافت
کھائی ہے بہت مار وہ جس سے بھی لڑا ہے

ماتحت کی حالت ہے یہ افسر کے مقابل
بکرا کسی قصاب کے جوں در پہ کھڑا ہے

جوّاد جو تحفے میں کلائی کی گھڑی دوں
سمجھیں نہ کہیں وہ کہ خوشامد کا کڑا ہے

جن کا کہنا ہے کہ عورت لطافت و نزاکت کا مجموعہ ہے شاید ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی۔ ایک بیچارہ شوہر۔ (کے ایچ مجاہد)

اینٹ کا جواب



بابا شوقی۔ دھمال نگر

نبیلہ چودھری۔ بہاولپور

چوری کیا ہے؟

غریب کے لیے جرم امیر کے لیے فن اور سیاست دانوں کے لیے ترقی کا زینہ۔

بے روزگاری کی تعریف کریں۔

مرضی کا کام نہ ملنے تک کوئی اور کام نہ کرنا۔ پڑھے لکھوں میں یہ بیماری عام ہے۔

نسیم۔ جھنگ صدر

عورت زیادہ عقل مند ہوتی ہے یا مرد؟

زیادہ عقل مند تو مرد ہی ہوتے ہیں لیکن عورتوں کو دیکھ کر ان کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے اس لیے کم عقل سے کم عقل عورت بھی عقل مند سے عقل مند مرد کو منٹوں میں الو بنا لیتی ہے۔

ذوالفقار حیدر۔ چنیوٹ

شاعر کو سب سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے

ہمدردی کی۔

محمد اسماعیل ساحل۔ خوشاب

نوجوان نسل مذہب سے بے زار کیوں ہوتی جا رہی ہے؟

اہلِ مذہب کی "حرکات" کی وجہ سے۔

محمد شریف شاہین۔ سرگودھا

عورت فضول خرچ ہو تو مرد کو کیا کرنا چاہیے؟

مرد پھر کیا کر سکتا ہے جو کرنا ہے عورت نے کرنا ہے ہاں مرد اگر کچھ کرنا چاہے تو پھر زیادہ سے زیادہ کمائے یا چوریاں کرے ڈاکے ڈالے تاکہ عورت کھل کر خرچ کر سکے ہاں اگر آپ نے یہ سوچ کر مجھ سے رجوع کیا ہے کہ میں آپ کو اس کا کوئی علاج بتاؤں گا تو میں جب اپنی بی بی کا کوئی علاج نہیں کر سکا تو آپ کو کیا بتاؤں گا۔

محمد سلیم ملک۔ آزاد کشمیر

آج کل محبت کم کیوں ہوتی جا رہی ہے؟

یہ آپ سے کس نے کہا سوشل میڈیا پہ آ کر دیکھیں آپ کو پتا چلے گا کہ محبت کی تو زیادتی ہو گئی ہے۔

محمد عارف۔ سرگودھا

آدمی زندگی میں سب سے تیز کب دوڑتا ہے؟

جب محبوبہ کے بھائی Dating کرتے دیکھ لیں۔

احمد خان۔ گجرات

میں تین شادیاں کر چکا ہوں اور چوتھی کرنا چاہتا ہوں؟

پوچھا ہے ہیں چلیں۔بسم اللہ کریں نیک کام میں دیر کیسی۔

درا صل میری پہلی تینوں بیویاں مر چکی ہیں اس لیے اب کوئی مجھ سے شادی پر تیار نہیں ہوتی۔

کوئی ایسی عورت ڈھونڈیں جس کے ایک دو مرد مر چکے ہوں۔اور پھر اللہ کی قدرت کا کرشمہ دیکھیں۔

فرزانہ۔سرگودھا

جوش اور ہوش میں کیا فرق ہے۔

جوش وہ چیز ہے جس میں آ کر بندہ پہلے محبت اور پھر شادی کر بیٹھتا ہے اور ہوش وہ چیز ہے جو شادی کے بعد آجاتی ہے کہ کیا کر بیٹھا ہوں۔

کلثوم۔حیدرآباد

اگر میاں بیوی گاڑی کے پہیے ہیں تو بچے؟

جیک۔کیونکہ جب بھی کوئی پہیہ پنکچر ہوتا ہے یہ جیک ہی گاڑی کو دوبارہ چلانے کے قابل بناتے ہیں۔

شمیم الرسول۔سرگودھا

چولھا پھٹنے سے مرد کیوں نہیں مرتے؟

اب مرتے ہیں کیونکہ اکثر عورتوں نے ہانڈی روٹی پہ مردوں کو لگا دیا ہے۔

مظہر نعیم بٹ۔فیصل آباد

آپ کی پسندیدہ ڈش کون سی ہے؟

بھیجا۔چاہے حیوانی ہو یا انسانی۔

ھاشم علی۔جھنگ

جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے پھر بھی یہ پھیل جاتا ہے کیوں؟

کیونکہ اسے میڈیا کے پر دستیاب ہوتے ہیں۔

جہاں زیب انور۔سرگودھا

اگر مسجد میں جوتا چوری ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

کوئی اچھا سا جوتا پہن کر گھر آجانا چاہیے اور آئندہ ہمیشہ کوئی پرانا جوتا پہن کر جانا چاہیے جسے اٹھانے کی کوئی ہمت نہ کر سکے۔

محمد طارق۔کراچی

بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی کیوں غنیمت سمجھنی چاہیے کچھ اور کیوں نہیں؟

یہ پرانا محاورہ ہے اب تو چور بھی تھری پیس پہنتے ہیں جو اگر ہاتھ آجائے تو ہزاروں کا ہوتا ہے بشرطیکہ لنڈے کا نہ ہو۔اس لیے اب محاورہ بدل کر یوں کر دینا چاہیے:

"بھاگتے چور کی پینٹ ہی سہی"۔

احمد ندیم رانجھا۔سرگودھا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟۔

دوسرا دورہ پڑا ہے۔ہر کسی پر آجاتا تھا اس لیے۔

کشور۔ملتان

آپ کیا کھاتے ہیں؟۔

کان اور دماغ۔

آپ نے کبھی جہاز اڑایا ہے؟

کئی بار رقم دے کر۔اکثر نالیوں میں پڑے ہوتے ہیں۔

آپ کے پسندیدہ مضامین؟

عشق محبت پیار (Love)۔

دنیا کی سب سے مشہور چیز۔

ہم بقلم خود

نازیہ۔فیصل آباد

اقوام متحدہ (UNO) سے کیا بنتا ہے؟

مسلمانوں کا قیمہ۔

او آئی سی (OIC) کا کیا مطلب ہے؟

کاش کوئی مطلب ہوتا۔

محمد ریان۔سرگودھا

جس میں مجھے کوئی عہدہ مل جائے۔

میں جب بھی گانے لگتا ہوں ہمسایوں کا کتا بھونکنے لگ جاتا ہے؟

وہ ڈر جاتا ہوگا۔

اسماعیل۔گوجرہ

آپ شادی شدہ ہو کے شادی کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

میں شادی کی نہیں بیویوں کی مخالفت کرتا ہوں ویسے بھی ڈوبنے والا ہی بہتر بتا سکتا ہے کہ پانی کہاں زیادہ گہرا ہے۔

کیا آپ سنجیدہ ہو سکتے ہیں؟

جی بالکل، اگر کوئی میری دوسری شادی کرا دے تو۔۔۔

حماد حیدر۔جھنگ

کیا آپ کلابازی لگا سکتے ہیں؟

میں کوئی بندر یا سیاستدان تھوڑی ہوں۔

آپ نے کبھی محبت کی؟

ہر چوتھے دن ہو جاتی ہے۔

کیا آپ سے دوستی ہو سکتی ہے؟

لوڈ کراتے رہو تو دوستی پکی۔

عرفان رضا۔سرگودھا

چڑے کون کھاتا ہے؟

بلی اور گوجراں والے کے پہلوان، ویسے کھاتے تو وہ بکرے ہیں چڑے سے ڈکار مارتے ہیں۔

شیکسپئر اور آغا حشر کا موازنہ کریں۔

آغا حشر تمھاری یہ بات سن لیتے تو حشر کر دیتے۔

آپ کبھی ڈزنی لینڈ گئے ہیں؟

پچھلے ہفتے گیا تھا، تم پر بھی ٹکٹ لگا ہوا تھا۔

ابراہیم۔گوجرہ

آپ کتنی شادیوں کے قائل ہیں؟

الحمد للہ مسلمان ہوں اور پوری چار کا ہی قائل ہوں۔یہ الگ بات کہ ہوتی دوسری بھی نہیں۔

سنا ہے بے بے شوکتی آپ سے نہیں ڈرتی؟

بیویاں کب مردوں سے ڈرتی ہیں۔وہ تو اکثر اب خدا سے بھی نہیں ڈرتیں۔

سنا ہے آپ بیوی سے بہت ڈرتے ہیں؟

کیا آپ نہیں ڈرتے؟؟



افتخار راغب

شادیاں کر چکا ہوں تین سے میں
اب ہوں خائف ہر اک حسین سے میں
کس قدر کانپتا ہوں بیوی سے
کہہ نہیں سکتا کچھ یقین سے میں
جھولتا ہوں اُسی کے جھولے پر
دشمنی کیسے کر لوں چین سے میں
کچھ تو پہنچے گا آسماں تک بھی
پھینکتا ہوں بہت زمین سے میں
بادلوں کا بھی گیان ہے مجھ کو
کم نہیں ہوں کسی ذہین سے میں
کون کیا کر رہا ہے میرے خلاف
دیکھ لیتا ہوں دوربین سے میں
ایک دن آنکھ بھی دکھا دوں گا
ڈرنے والا نہیں ہوں چین سے میں
کچھ کہوں گا تو وہ کہیں گے جھوٹ
کیا کہوں اپنے قائدین سے میں
داد روبوٹ کی طرح دیں لوگ
شعر پیدا کروں مشین سے میں
شعر کہتا ہوں اُن کی بیوی پر
چھپ کے رہتا ہوں حاسدین سے میں
چند ہی دوست رہ گئے راغبؔ
بچ رہا تھا منافقین سے میں

افتخار راغب

چلو واعظ سے چل کر پوچھتے ہیں
"ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا"
ہو غم کیوں بیوی کی ڈانٹ سن کر
"شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا"
دکھائے گا نیا فیشن یہ آخر
"کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا"
کریں گے اور کیا کیا دوست میرے
"ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا"
وہ ہے بیگم ہماری اور خادم
"ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا"
ہوئے ہیں قتل ہم سسرال جا کر
"شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا"
بڑھاپے میں کسی بڑھیا پہ راغبؔ
"نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا"

سلسلے وار ناول

پہلی قسط

قیس چلبلائی

ارشاد العصر جعفری

آج دل نے ایک نئی فرمائش کر دی۔

''قیس صاحب۔ گالیاں تو سنیں''

دل کی اس فرمائش پر ہم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی ایسی ہستی نظر آئے تو دل کی فرمائش پوری کی جائے لیکن ابھی ارد گرد کوئی بھی ایسی ہستی موجود نہیں تھی۔

ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے دل کی اس فرمائش پر آپ کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئی ہیں اور شاید آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ دل کی یہ کیسی فرمائش ہے۔ تو ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ یہ ہمارا دل ہے۔ یعنی قیس چلبلائی۔ ایم ایس سی۔ سڑکیات۔ ڈی ایس سی۔ آواریات۔ یونیورسٹی آف عشقیات۔ یہ دل کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ کسی بھی چیز کی فرمائش کر سکتا ہے۔ اس دل کے مالک کی پیدائش پر اس دل کو جنم دینے والی ہستی یعنی ہماری والدہ نے کہہ دیا تھا کہ۔

''پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں۔۔۔'' ہماری والدہ ماجدہ کا ہمارے بارے میں یہ آفاقی بیان پڑھ کر یقیناً آپ کے دل میں خواہش جنم لے رہی ہوگی کہ آپ ہمارے بچپن سے بھی آگاہی حاصل کریں۔ ہمارا آپ سے وعدہ ہے کہ ہم آپ سے کچھ بھی نہیں چھپائیں گے۔ اپنے بچپن کے کارنامے بھی آپ کے علم میں لائیں گے۔ تبھی تو آپ ہمارے بارے میں جان پائیں گے اور پھر آپ فخر کریں گے کہ ایسی عظیم اور مہان ہستی آپ کے درمیان میں موجود ہے۔

لیکن پہلے ہم آپ کو دل کی اس فرمائش کے انجام کے متعلق تو بتاتے چلیں تاکہ اگر آپ عبرت حاصل کرنا چاہیے تو آپ کے سامنے کوئی واقعہ تو ہو۔



جی۔ ہم آپ کو بتا رہے تھے کہ دل کی فرمائش پر ہم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور پھر چند لمحوں بعد ہماری نظر ''کالو'' پر پڑی۔ کالو بہت ہی بدقسمت لڑکی تھی۔ کیونکہ ہمارے ملک میں پیدا ہو گئی تھی۔ جہاں اس کے حسن کی قدر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اگر یہی کالو ویسٹ انڈیز یا افریقہ کے کسی ملک میں پیدا ہوئی ہوتی تو وہاں حسن کی شہزادی کہلاتی۔ کالو تھی بہت تیز لڑکی۔ گالیاں سنانے میں تو اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کی تیز طرار زبان ایسی تھی کہ محلے کی بزرگ خواتین اپنی بچیوں اور بہوؤں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔

ایک بار یا اپنے ہی جیسی تیز طرار لڑکی سے باتیں کر رہی تھی کہ لڑکی نے اس سے پوچھا۔

''کالو۔ یہ بتا یہ لڑکے اپنی محفلوں میں کسی قسم کی باتیں کرتے

ہیں“......حالانکہ اس سوال کا جواب تو اسے بھی معلوم تھا لیکن اس نے انجان اور معصوم بنتے ہوئے پوچھا۔

”لو۔تمہیں نہیں پتا کہ یہ لڑکے آپس میں کس قسم کی باتیں کرتے ہیں“......کالو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔تیری قسم۔مجھے تو نہیں پتا“......لڑکی نے نہایت ہی معصوم سے لہجے میں کالو کی قسم کھاتے ہوئے کہا۔

”ارے بیوقوف، پاگل۔یہ لڑکے بھی اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں جس طرح کی ہم کرتی ہیں“......کالو نے کہا۔

”ہائے اللہ۔یہ لڑکے کتنے بے شرم ہوتے ہیں کالو“......لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا اور دوپٹے کا پلو دانتوں میں لے لیا۔اب وہی کالو ہمیں نظر آ گئی تھی۔نان سٹاپ گالیاں دینے میں اس نے ڈپلومہ کیا ہوا تھا۔بہت سے لڑکوں کو بھرے چوک میں بے عزت کر چکی تھی۔گالیاں سننے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔لہٰذا جیسے ہی وہ قریب آئی۔ہم نے اس سے کہا۔

”ہائے......“اس نے صرف نظر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

”ہم نے کہا روپ کی رانی۔ہماری طرف بھی دیکھو۔ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں“......ہم نے خالص لوفرانہ انداز میں کہا تو اس نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔ہم نے سوچا کہ وہ ہمیں شہہ دے رہی ہے تاکہ ہم اسے مزید تنگ کریں تو وہ ساری کسر ایک دفعہ ہی نکال دے۔یہ سوچ کر ہم نے پھر اس سے کہا۔

”تمہاری یہ حسین ادائیں، تمہاری یہ مورنی جیسی چال۔ہائے تم نے تو چھری پھیر کر رکھ دی ہے ہمارے دل پر“

”شکر ہے۔تمہارے دل میں بھی میرے لئے جگہ بنی“......کالو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آج سے تھوڑی ہے سوئٹ ہارٹ۔یہ تو برسوں سے، بلکہ صدیوں سے ہے“......ہم نے فلمی انداز میں کہا۔

”واقعی۔؟ میرے رانجھے“......کالو نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

”ہاں۔تیرے اس چمکتے دمکتے حسن کی قسم“......ہم نے کہا۔ہمارا خیال تھا کہ چمکتے دمکتے حسن کا سن کر وہ غصے میں آجائے گی۔کیونکہ وہ اور حسن......ان دونوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا مگر ہماری بات سن کر وہ شرمانے لگی۔

”یا اللہ خیر۔یہ آج میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے“......ہم نے دل ہی دل میں کہا پھر ہم نے کالو سے کہا۔

”کالو۔دراصل میں تمہیں چھیڑ رہا تھا“۔

”کوئی بات نہیں۔محبت میں چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی ہے۔جس میں چھیڑ چھاڑ نہ ہو وہ بھی بھلا کوئی محبت ہوتی ہے“......کالو نے محبت پاش نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں......میں تمہیں یہ کہہ رہا ہوں کہ“......

”اچھا باقی باتیں پھر کریں گے۔اب میرا گھر آ گیا ہے۔میں جلد ہی تمہارے گھر آؤں گی“......کالو نے ہماری بات کاٹتے ہوئے کہا۔پھر وہ تیز تیز قدم اٹھا کر گھر میں گھس گئی۔

دھت تیرے کی“......ہم نے اپنی ہتھیلی پر اپنا مکہ مارتے ہوئے کہا۔



ہم اپنے کمرے میں بیٹھے کتاب ”محبوب پٹانے کے ۱۰۱ طریقے“ عرف ”محبوب آپ کے قدموں میں“ پڑھ رہے تھے۔اس کتاب کو پڑھ کر اور اس میں لکھے طریقوں پر عمل کر کے انسان ۲۰۲ مرتبہ باآسانی بھرے بازار میں ”پٹ“ سکتا تھا۔ہم نے ابھی کتاب کے چند صفحے ہی پڑھے تھے کہ آواز سنائی دی۔

”رانجھا کہاں ہے۔میں اس کے لئے چوری بنا کر لائی ہوں۔وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے چوری کھانے کا بہت شوق ہے“......ہم نے آواز فوراً پہچان لی۔یہ آواز کالو کی تھی۔

”رانجھا۔کون رانجھا۔یہاں تو کوئی رانجھا نہیں رہتا“......یہ

حیرت بھری آواز والدہ صاحبہ کی تھی۔

''آپ کا بیٹا قیس، قیس چلبلائی جسے صحرائی کہلانے کا بھی بہت شوق ہے۔ اس کی پیدائش کے وقت کہیں آپ صحرا کا سفر تو نہیں کر رہی تھیں'' ...... کالو کی آواز سنائی دی۔

''ہوش کے ناخن لو لڑکی۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو'' ...... والدہ صاحبہ کی غصیلی آواز سنائی دی۔

''سوری آنٹی۔ دراصل آپ کے بیٹے قیس نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ بہر حال وہ آج کل رانجھا بنا پھرتا ہے۔ مجھ سے کہتا ہے تیس چالیس بھینسیں لے لو۔ میں ساری عمر ان کی خدمت کرتا رہوں گا'' ...... کالو نے فوراً ہی معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا۔ تم کمال کی بات کر رہی ہو۔ میں نے اس کی پیدائش پر اس کا نام کمال رکھا تھا لیکن اس کے باپ نے اس کا نام قیس رکھ دیا اور اب وہ قیس چلبلائی بنا پھرتا ہے۔ ویسے اس نے دنیا میں آ کر بہت سے کمال دکھائے ہیں اور ابھی نجانے کتنے کمال دکھائے گا'' ...... قیس کا نام سن کر والدہ صاحبہ نے ہمارے بچپن کا نام لیتے ہوئے کہا جواب متروک ہو چکا تھا۔

''جی۔ جی۔ آپ کا وہی باکمال کارنامہ۔ کہاں ہے وہ'' ...... کالو کی آواز سنائی دی۔

''میں بلاتی ہوں اسے۔ قیس'' ...... والدہ صاحبہ نے پہلے کالو سے کہا پھر بلند آواز میں ہمیں پکارا۔ ہم نے کتاب جلدی سے تکیئے کے نیچے رکھ دی اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ والدہ صاحبہ کی ایک دو آوازیں اور بھی آئیں مگر ہم نے کوئی جواب نہ دیا۔

''یہ اس کا کمرہ ہے۔ جاؤ دیکھ لو اپنے باکمال رانجھے کو'' ...... والدہ صاحبہ کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا ہم نے ہلکی سی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ کالو ہمارے سامنے تھی۔

''یہ کون سا وقت ہے سونے کا۔ اٹھو رانجھا جی۔ دیکھو تمہاری ہیر تمہارے لئے چوری بنا کر لائی ہے۔ مکھن کی چوری'' ...... کالو نے کہا پھر ہمارے پاؤں پکڑ کر ہلائے۔ ہم نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ پھر کالو کو ایک نظر دیکھا اور چیخ ماری۔

''چڑیل۔ چڑیل۔ بھوت۔ بھوت'' ...... کہتے ہوئے ہم

لندن کی ایک ایسی بھی کاروباری شخصیت تھی جس سے ایک مقامی اخبار کا ایڈیٹر اشتہار لینے سے قاصر تھا۔ اُس شخصیت کا موقف تھا کہ نہ تو اُس نے خود کبھی کسی کمپنی کا اشتہار پڑھا ہے اور نہ ہی اُسے اس بات کا یقین ہے کہ کوئی دوسرا شخص بھی اشتہارات کو پڑھتا ہوگا یا اُس پر یقین کرتا ہوگا۔

"اگر میں آپ کو قائل کر دوں کہ لوگ اشتہارات پڑھتے ہیں، تو کیا آپ ہمارے اخبار کے لئے اشتہار دیں گے؟" ایڈیٹر نے پوچھا۔

"بالکل ۔۔۔ کیوں نہیں!!" طنزیہ جواب تھا "لیکن میرا قائل ہونا شرط ہے۔"

روزنامے کی اگلی اشاعت میں اُس گھاگ ایڈیٹر نے یک سطری خبر چلا دی جو ان مبہم الفاظ پر مشتمل تھی "سارا لندن متجسس ہے کہ جینکنز کیا کرنے جا رہا ہے؟"

اگلے روز وہ کاروباری شخصیت خود اُس ایڈیٹر کو ڈھونڈتی ہوئی اُس کے دفتر پہنچ گئی۔ اُس نے اعتراف کیا کہ توقع کے خلاف اسے متجسس لوگوں نے اس نام نہاد خبر کی بابت پوچھ پوچھ کر عاجز کر دیا ہے اور یہ کہ اب وہ اگلی اشاعت میں اس مدیرانہ وضاحت کے اشتہار کا فنانسر ہوگا کہ جینکنز یہ کرنے جا رہا ہے کہ اُس کے اخبار میں اشتہار دینے جا رہا ہے۔

ایک بار اشتہار دینے کے بعد، جینکنز اب بھی اشتہار دیتے ہیں۔

اچھل کر بستر سے نیچے آئے اور چیختے چلاتے چھت کی طرف دوڑے۔ چھت پر پہنچ کر ہم مرغیوں کے ڈربے میں گھس گئے۔ ہمیں دیکھ کر مرغیوں نے احتجاج شروع کر دیا۔

''آنٹی جی۔لگتا ہے رانجھا خواب میں ڈر گیا ہے''...... چند لمحوں بعد ہمیں کالو کی آواز سنائی دی۔

''ارے۔باہر نکلو''...... والدہ صاحبہ نے ڈربے کے قریب آ کر کہا۔ہم آہستہ آہستہ ڈربے سے باہر نکلے تو کالو کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔

''ہائے۔رانجھا جی کیسے بھوت بنے ہوئے ہیں۔شاید آئینہ دیکھ لیا تھا اس لئے ڈر گئے تھے''...... کالو نے ہنستے ہوئے کہا۔ہم شرمسار سے ایک طرف کھڑے ہوئے تھے جبکہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''رانجھا جی۔چوری تمہارے کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔وہ کھا لینا اور ہاں میں نے ابا جی سے بات کر لی ہے۔تیس چالیس تو نہیں البتہ تین چار بھینسیں لے دیں گے۔بس تم ان کی خدمت کے لئے تیار رہو''...... کالو نے کہا اور کھی کھی کرتی ہوئی چلی گئی۔ہم بھی اس کے جانے کے بعد نیچے آ گئے لیکن ہم اماں سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔

''یہ کیا چکر ہے''...... اماں نے ہمیں گھورتے ہوئے کہا۔

''معلوم نہیں امی۔یہ تو ویسے ہی کمبل ہو رہی ہے''...... ہم نے معصوم سی صورت بنا کر کہا۔

''میں تو تیری پیدائش کے دن سے کہہ رہی ہوں کہ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں''...... اماں نے کہا۔

''ویسے امی جان۔اگر کالو کے ساتھ بھائی جان کی شادی ہو جائے تو ہم گھاٹے میں نہیں رہیں گے''...... اسی لمحے چھوٹے بھائی نے اپنے کمرے سے برآمد ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے''...... اماں نے پوچھا۔

''ہم کالو بھابی پر ٹکٹ لگا دیں گے۔روزانہ سینکڑوں ہزاروں لوگ اس عجیب و غریب مخلوق کو دیکھنے آئیں گے۔پھر تو ہم دنوں میں امیر ہو جائیں گے امی جان''...... بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم نے اسے گھور کر دیکھا تو اس کی مسکراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ہم کچھ کہے بغیر گھر سے باہر آ گئے۔



ہم منی سینما گھر سے لوٹ رہے تھے۔رات کافی اندھیری تھی اور ہم خراماں خراماں اپنے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک آواز سن کر رک گئے۔

''رانجھا جی''۔

ہم نے آواز کی سمت دیکھا۔یہ کالو کا گھر تھا۔کالو دروازے پر کھڑی تھی پھر وہ دروازے سے باہر نکلی اور اس نے ہمیں بازو سے پکڑا۔

''آؤ رانجھا جی''...... اس نے کہا۔شاید ہمارے سوچنے کی حس سو چکی تھی۔اس لئے ہم بلا ارادہ ہی اس کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے۔وہ ہمیں لے کر چھت پر پہنچ گئی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم آج کل اس منی سینما گھر میں آتے ہو اور یہاں جس قسم کی فلمیں چلتی ہیں ان پر پولیس کے چھاپے بھی بہت پڑتے ہیں۔جس دن دھر لئے گئے تو سیدھے جیل جاؤ گے''...... کالو نے کہا۔

''تمہارے ابے کو جب پولیس اس منی سینما گھر سے پکڑ کر لے گئی تھی تو چھڑا کر کون لایا تھا''...... ہم نے کہا۔

''کون چھڑا کر لایا تھا؟'' کالو نے روانی میں کہا۔

''میں۔جب میں تمہارے ابے کو چھڑا کر لا سکتا ہوں تو کیا خود کو نہیں چھڑا سکتا''...... ہم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زیادہ باتیں نہ بناؤ۔میرے ابو اس چکر میں کبھی تھانے نہیں گئے''...... کالو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''پھر کس کس چکر میں تھانے گئے ہوئے ہیں۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ''......ہم نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''ان جگت بازیوں کو رہنے دو اور مجھ سے پیار کی باتیں کرو۔ میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں'' کالو نے اس مرتبہ پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''میرا انتظار کر رہی ہو۔ مگر کیوں''......ہم نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہیر اپنے رانجھے کا انتظار کیوں کرتی تھی''......کالو نے کہا۔

''ہیر کی روح ملے گی تو پوچھ کر بتاؤں گا''......ہم نے طنزیہ لہجے میں کہا لیکن طنز اس نے محسوس ہی نہ کیا۔

''ایک تو ٹو مخول بہت کرتا ہے۔ ناٹی بوائے''......کالو نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

''ہاں۔ میں نے سرکس میں بھی تو کام کرنا ہے''......ہم نے ایک مرتبہ پھر طنزیہ لہجے میں کالو سے کہا۔

''رانجھا جی۔ مجھے احساس ہے کہ تم مجھے بہت چاہتے ہو۔ اسی ایک احساس کی وجہ سے میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ اور وہ فیصلہ میری زندگی کا بہت اہم فیصلہ ہے''......کالو نے کہا۔

''کیا؟''......ہم نے پوچھا۔

''میرے ابو ہمارے راستے کی دیوار بنیں گے۔ پھر میرا ایک چچا بھی ہے جو بالکل کیدو کی طرح ہے۔ وہ دونوں نہیں چاہیں گے کہ ان کی اتنی سوہنی دھی ایک آوارہ، لوفر اور بدصورت لڑکے سے عشق کرے اور اس سے شادی بھی کرے''......کالو نے کہا۔

''ہائیں۔ اتنی سوہنی دھی، آوارہ، بدصورت اور لوفر''......

حیرت کی شدت سے ہم سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

ہاں۔ مگر تم فکر نہ کرو تم جیسے بھی ہو مجھے پسند ہو۔ تم ایسا کرو کہ مجھے بھگا کر لے جاؤ''......کالو نے کہا۔

''میں تمہیں بھگا کر لے جاؤں......مگر کیوں''......ہم نے حیرت سے اچھلتے ہوئے کہا۔

''اس لئے کہ میرے ابا جان میری شادی کہیں اور کر دیں گے''......کالو نے وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

''وہ تمہاری شادی کہیں بھی کر دیں۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہے''......ہم نے کہا۔

''تمہیں مجھ سے محبت ہے نا۔ ویسی ہی محبت جیسی رانجھے کو ہیر سے تھی''......کالو نے کہا۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔ کس بے وقوف نے تم سے یہ کہا ہے'' ہم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم نے۔ اس دن تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم صدیوں سے مجھ سے محبت کرتے ہو''......کالو نے کہا۔

''ارے بابا۔ اس دن بھی میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے تم سے چھیڑ خانی کی ہے۔ مجھے تم سے کوئی محبت وحبت نہیں ہے''......ہم نے جھنجھلا کر کہا تو اس کی آنکھوں سے آگ سی برسنے لگی۔

''ہونہہ۔ تو اس دن تم نے میرا مذاق اڑایا تھا''......اس نے سپنی کی مانند پھنکارتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ اس دن میرا دل چاہتا تھا کہ میں کسی لڑکی سے گالیاں سنوں۔ اس سلسلے میں تم شہرت کی بلندیوں پر ہو۔ تم نظر آ گئیں تو میں نے تمہیں چھیڑ دیا''......ہم نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اس وقت تو تم جاؤ کیونکہ تم میرے گھر پر ہو مگر یاد رکھنا عورت اپنی بے عزتی کا انتقام بہت برا لیتی ہے اور میں تم سے انتقام لوں گی''......کالو نے غصے سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ارے تم عورت ہو''......ہم نے چونکتے ہوئے کہا۔

''تو تم کیا سمجھتے ہو''......کالو نے ہمیں آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''میں تو تمہیں لڑکی سمجھتا تھا''......ہم نے نہایت ہی معصومیت سے کہا۔

"شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ"...... اس نے پہلے سے بھی زیادہ غصیلے لہجے میں کہا۔



عید کی آمد آمد تھی۔ بازار میں حد سے زیادہ بھیڑ تھی۔ عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی جیسے برسات میں جوہڑوں پر مینڈکوں کی۔ ہم بھی آنکھیں سینکنے کے لئے بازار میں موجود تھے۔ ہم ایک پری وش کو دیکھ رہے تھے کہ ہمیں ایک زوردار دھکا لگا۔ ہم لڑکھڑا گئے۔ سنبھل کر دیکھا تو سامنے کالو تھی۔ اس کے ہاتھ سے شیشے کا جگ اور گلاس گر کر ٹوٹ چکے تھے جبکہ کالو کے رونے کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ کافی لوگ ہمارے قریب کھڑے ہو گئے تھے۔

"تمہیں شرم نہیں آتی۔ مجھے اکیلا دیکھ کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ پچھلے چوک میں تم نے میرا پاؤں کچلا۔ پھر مجھے بازو سے پکڑا۔ اب تم نے ٹکر مار کر میرا اتنا نقصان کر دیا" کالو نے روتے ہوئے کہا۔

ہمارے اوسان معطل ہو چکے تھے۔ ایسی صورت حال پہلے کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ ہم چپ چاپ کھڑے تھے۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ اس ملک میں غیرت مند لوگ نہیں رہتے جو تم میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ یہاں سب غیرت مند ہیں۔ جو بے غیرتی دکھاتا ہے اسے مزہ چکھا دیتے ہیں"...... کالو نے وہاں موجود لوگوں کی غیرت کو جگا دیا۔ اس کے اس جملے نے واقعی جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایک آدمی ہماری طرف بڑھا۔

"اب لڑکیوں کو چھیڑتا ہے"...... اس نے ہماری کمر پر ایک دھپ رسید کیا۔ کالو اسی لمحے کھسک گئی جبکہ ایک نوجوان آگے بڑھا۔

"ٹھیک ہے۔ لڑکیوں کو چھیڑنا لڑکوں کا حق ہے۔ مگر تمہاری آنکھوں پر کیسی پٹی بندھی ہے کہ تمہیں لڑکی اور افریقن بھینس میں فرق ہی نظر نہیں آیا"...... نوجوان نے ہمیں مکا مارتے ہوئے کہا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ یہ ہے۔ تمہارا معیار۔ اسی معیار پر پڑے گی تمہیں مار"...... ایک اور نوجوان نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"آئندہ چھیڑنا ہو تو کسی حسین و جمیل لڑکی کو چھیڑنا۔ تاکہ مار بھی پڑے تو افسوس نہ ہو۔ اب گھر کی طرف دوڑ لگاؤ ورنہ حقیقتاً بہت مار پڑے گی"...... ایک اور نوجوان نے نصیحت کی تو ہم وہاں سے کھسکنے لگے۔

(قیس کے بقیہ ہنگامے اگلے ماہ)



مجاہد ادیب شیخ

عشق کا دردِ لادوا نہ ملا
اور حسینوں کا آسرا نہ ملا

بھاگ ہی جاتی موقع پا کر وہ
ڈھنگ کا اُس کو آشنا نہ ملا

گھوڑے دوڑاتے بحرِ ظلمات میں
کوئی دریا نواح کا نہ ملا

ملتے سیلاب میں بھی آجاتے
کوئی کشتی کوئی گھڑا نہ ملا

ڈش کا کیبل کا شور گھر گھر میں
کوئی در ہم کو بے صدا نہ ملا

جا گھسے سب اسمبلیوں کے بیچ
شہر میں اب کوئی گدھا نہ ملا

توڑتے ہم ریکارڈ مجنوں کا
ہم کو صحرا کا آسرا نہ ملا

مجاہد ادیب شیخ

روتے رہنا دیر تلک
"چوتے" رہنا دیر تلک

دوڑ ہے زندہ قوموں سے
"موتے" رہنا دیر تلک

اپنی قومی عادت ہے
سوتے رہنا دیر تلک

داداگیروں کے آگے
"پوتے" رہنا دیر تلک

یہ تو رقیبو! ٹھیک نہیں
دھوتے رہنا دیر تلک

خود کو اُس کی الفت سے
جوتے رہنا دیر تلک

نوکری ہو یا چھوکری ہو
ڈھوتے رہنا دیر تلک

ہانک نہ یوں الٹی سیدھی
کھوتے رہنا دیر تلک

یوں بھی شاعر کیا بنتا
توتے رہنا دیر تلک

خوبصورت



نوید ظفر کیانی

کیوں بے ٹیٹے! تو کاہے کو ٹن سا ہوا ہے
آنکھیں بھی ہیں چوپٹ سی اور منہ بھی کھلا ہے
کیا بتلاؤں بھیا میں نے کیا دیکھا ہے
کوئی پٹاخہ ہے، انگارہ ہے، شعلہ ہے
ابھی ابھی وہ میرے آگے سے گزری ہے
وہ کیا گئی ہے، تن من میرا ساتھ گیا ہے

اُس کی آنکھوں میں کیا وحشت تھی ہرنی سی
اُس کی چال میں ایک نزاکت تھی ہرنی سی
اُس کا چہرہ جیسے روشن روشن دن ہو
دنیا کے ہر حسن کا جیسے یہ مخزن ہو
کیسی شہزادی سی شان تھی اُس کی ہائے!
اُس کا لبادہ جیسے کوئی فیشن ان ہو

میرے دل میں، میری زباں پر وہ رہتی ہے
مجھ کو ہے معلوم کہاں پر وہ رہتی ہے
مولا کی جانب سے مجھ کو گفٹ ہوئی ہے
ہر دھڑکن جس کی مرہونِ لفٹ ہوئی ہے
میری ذات کا تانا بانا بنتا تھا سو
کل ہی میرے ساتھ کے گھر میں شفٹ ہوئی ہے

کیوں بھئی ٹیٹے! ہو جائیں پھر اُس کے قصے
جس کے پیچھے تم مجنوں تھے، دیوانے تھے
چھوڑیں جی مت بات کریں، وہ افسانہ تھی
جس میں عشق نہ سمٹے ایسا پیمانہ تھی
اُس کا حسن بجا لیکن آوازہ اُس کی
میری بھی آواز سے بڑھ کر مردانہ تھی

محمد شاہین تونسوی
تونسہ شریف



ڈراپ سین

میں جونہی اقبال میڈیکل سٹور کی سیڑھیوں پر قدم رکھا، اقبال کی تیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جو اپنے ملازم سے کہہ رہا تھا ''کم بخت! کتنی دفعہ سمجھایا ہے کہ جب صبح صبح دوکان کھولو تو ''بسم اللہ'' کے ساتھ ساتھ ''لاحول ولا'' بھی پڑھ لیا کرو تاکہ دن تو سکون سے گزرے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ پر طنز کر رہا ہے۔ میں ابھی جواب دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھ سے پہلے ملازم بول اٹھا ''سرکار! پڑھنے کو تو میں پڑھ دوں، مگر آپ نہیں آتے تو سارا دن اداس گزرتا ہے۔''

میرے منہ سے بڑا زوردار قہقہہ نکلا، بڑی زوردار چوٹ تھی جو اقبال کے گنجے سر پر ''ٹھاہ'' کر کے ''وجی'' تھی۔ اقبال کھسیانہ ہو کر ملازم پر برس پڑا ''نا ہنجار! شرم نہیں آتی! جس تھالی میں کھاتے ہو، اُسی میں چھید کرتے ہو؟''

اس بار میرے چھت پھاڑ قہقہے کے ساتھ اقبال کی کھسیانی ہنسی بھی شامل تھی۔۔۔ اقبال کا ملازم چونکہ ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارا مشترکہ دوست بھی تھا اور کافی حد تک ہم سے بے تکلف بھی تھا، اس لئے ہماری گپ شپ اکثر اسی انداز کی ہوا کرتی تھی

''۔۔۔اور سناؤ، کیسے ہو؟'' رسمی علیک سلیک کے بعد اقبال مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

''بس یار، ویسے کا ویسا ہی ہوں۔۔۔'' میں نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

''گویا کہ ابھی تک پاگل خانے میں ہی ہوں۔۔۔''

میں نے بڑی معصومیت سے اس کے سٹور کو پاگل خانے میں تبدیل کرتے ہوئے کہا اور اقبال مجھے گھور کر رہ گیا۔ اسے گھورتا دیکھ کر بے اختیار ہنسی نکل گئی اور میں نے ہنستے ہوئے پوچھا ''چلو چھوڑو۔۔۔ یہ بتاؤ کہ ''وہ'' کہاں ہے؟''

''گھاس چرنے گئی ہوئی ہے۔'' اقبال دوبارہ موڈ میں آتے ہوئے بولا۔

''بھئی، میں تم سے تمہاری ''عقل'' کا نہیں پوچھ رہا۔۔۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں ہنستے ہوئے کہا۔

''میں بھی تمہیں، تمہاری عقل کا بتا رہا ہوں۔۔۔'' اقبال نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا اور میں لاجواب ہو کر رہ گیا۔

''یار! تم تو ناراض ہی ہو گئے۔۔۔ میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ چائے کہاں ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"چائے نہیں ہے۔۔۔" اس نے بڑے مطمئن لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب۔۔۔نہیں ہے تو منگواؤ نا یار!" میں واقعی حیران ہو رہا تھا۔

"کہاں سے منگواؤں؟۔۔۔ہوٹل والا ہوٹل ہی چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔" اقبال بڑے اطمینان بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"کیوں بھاگ گیا ہے۔۔۔کیا اس کی ساس نے اس کے پڑوس میں کوارٹر کرائے پر لے لیا ہے؟" مجھے واقعی غصہ آ رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتہ، کیوں چھوڑ گیا ہے۔۔۔بہر حال، میری اب تم جیسے مفت خوروں سے جان چھوٹ گئی ہے کیونکہ دور دور تک اب کسی ہوٹل کا نام ونشان ہی نہیں ہے۔" اقبال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"گویا اب چائے نہیں ملے گی؟" میں نے بڑے اداس لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں، میری جان! ضرور ملے گی بلکہ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی ملیں گے بس یہ ہے کہ ساتھ والے "یتیم خانے" تک جانا ہوگا۔اس کا منیجر بڑا سخی ہے۔۔۔" اقبال نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"چلو، ٹھیک ہے۔۔۔دونوں چلتے ہیں، میں تمہیں جمع کرا دوں گا اور اس کے بدلے چائے پی لوں گا۔" میں نے جواباً طنز کیا۔

"چلو چھوڑو۔۔۔ایسا کرتے ہیں کہ پروفیسر کے پاس چلتے ہیں، گپ شپ بھی ہو جائے گی اور چائے بھی پی لیں گے۔" اقبال نے نیا شوشہ چھوڑا۔

"کیا مطلب۔۔۔کون پروفیسر؟" میں نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"کمال ہے، تم پروفیسر کو نہیں جانتے۔۔۔پروفیسر ڈنگ ڈونگ جو پورے محلے کی آن، بان، شان اور جان ہے۔۔۔؟" اقبال نے واقعی حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"کہیں یہ وہ پروفیسر تو نہیں ہے جو ابھی حال ہی میں ہمارے محلے میں آیا ہے اور اپنے آپ کو ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی، یوگا اور پتہ نہیں کن کن علوم کا ماہر بتاتا ہے؟" میں نے اپنی یادداشت والی جگہ پر ٹھونگے لگاتے ہوئے کہا اور اقبال کا سر زور زور سے اثبات میں ہلنے لگا۔

"یار! یہ سر کو اتنے زور زور سے نہ ہلایا کرو۔۔۔کسی دن کوئی طیارہ اگر اس ایئرپورٹ پر لینڈ کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا تو اس کا الزام تمہارے سر ہی پر آئے گا۔" میں نے اقبال کے گنجے سر پر طنز کیا۔

"وہ میں بھگت لوں گا، تم بس اٹھنے کی کرو۔۔۔ہاں، یہ یاد رہے کہ تم نے وہاں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ تمہیں بھی ان مضامین میں دلچسپی ہے اور تم پروفیسر کے شاگرد بننے کے خواہش مند ہو۔۔۔"

اقبال نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔۔۔اقبال پھر ملازم سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا جبکہ میری آنکھوں کے آگے فرحین سے آخری ملاقات کے واقعات گھومنے لگے جب آج سے دو ہفتے پہلے آخری دفعہ وہ مجھ سے کیفے میں ملی تھی۔

"کیا بات ہے، فرحین! کچھ دنوں سے تمہارا رویہ ہماری ملکی سیاست کی طرح بگڑا ہوا نظر آ رہا ہے؟" رسمی تکلفات کے بعد میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"تمہیں معلوم تو ہے کہ تین ہی شوق ہیں مجھے۔اچھا کھانا، اچھا پہننا، اور اچھا بناؤ سنگھار۔۔۔ لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ تم سے شادی کر کے ان میں سے ایک شوق بھی پروان نہیں

چڑھ سکتا۔" فرحین بڑے سکون سے بولی۔

"تو اب کیا تم نے کوئی اسمگلر تلاش کر لیا ہے شادی کے لئے۔۔۔؟" میں نے بڑے تپے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔۔۔اتنی خوش قسمت تو خیر، میں نہیں ہوں البتہ پانچ بیوٹی پارلر ہیں اس کے اور میرے لئے یہی بہت ہیں، اس لئے فی الحال تو میں اس سے شادی کر رہی ہوں" فرحین بڑے خوشگوار لہجے میں بولی۔

"یہ "فی الحال" کا کیا مطلب ہوا۔۔۔کیا یہ بھی "پنج سالہ منصوبہ" ہے تمہارا۔۔۔؟" میں نے بڑے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ اس کی "بقیہ زندگی" اتنی لگتی نہیں جتنی وہ سمجھ رہا ہے، اس لئے مجھے امید ہے کہ بہت جلد ہی وہ "ڈیتھ فلائنگ کوچ" میں بیٹھ کر "عدم آباد" کو پرواز کر جائے گا اور پھر "ہم تم ہوں گے، بادل ہوگا۔۔۔"

"۔۔۔اور آگے ساری پھسلن ہوگی۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کر دیا اور وہ مجھے گھور کر رہ گئی۔۔۔"چلو چھوڑو، مذاق ختم کرو۔" میں نے پینترہ بدل کر مسکراتے ہوئے کہا "چلو، کوئی پیار کی باتیں کرتے ہیں۔۔۔تم یہ بتاؤ کہ تمہارے محلے میں ٹینڈے سستے ہیں یا بینگن؟"

وہ آگ بگولہ ہوگئی، بولی "تمہارا کیا خیال ہے، میں اب تک مذاق کر رہی تھی؟۔۔۔ہر گز نہیں، یہ سو فیصدی حقیقت ہے۔ میں جا رہی ہوں، اب میرا انتظار بھی مت کرنا۔"

فرحین تو یہ کہہ کر اٹھ گئی لیکن میری دنیا اچانک ہی ویران کر گئی۔ میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا اور میرے دماغ پر ہتھوڑے برسنا شروع ہو گئے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔وہ تو اچھا ہوا کہ لائیٹ فوراً ہی واپس آ گئی ورنہ میں تو بیہوش ہونے والا تھا۔۔۔ارد گرد کا ماحول تو دوبارہ روشن ہو چکا تھا لیکن میرے دل کی دنیا اندھیری ہو چکی تھی۔ فرحین کو میں اپنی آرزوؤں کا "صدر دفتر" سمجھتا تھا اور وہ مجھے چاہتوں کا "منگلا ڈیم"۔۔۔مگر دولت کے لالچ میں آ کر وہ سب کچھ بھول چکی تھی اور صرف اس وجہ سے مجھے ٹھکرا کر چل پڑی کہ میرے پاس کار، کوٹھی اور بینک بیلنس نہیں تھا مگر اس کے باوجود بھی میرے دل میں اس کی محبت برقرار تھی۔ اس کے بغیر میں پوری زندگی تو کیا، زندگی کا ایک دن بھی نہیں کاٹ سکتا تھا چاہے مجھے ولایتی ٹوکہ مشین ہی کیوں نہ دے دی جاتی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا کہ میں کب کیفے سے باہر آیا، کب چوک پر پہنچا، کب سڑک کراس کی اور کب میرا پاؤں سڑک کے کنارے "خواب بلی" کے مزے لوٹتے ہوئے کتے کی دم پر پڑا۔ ہوش تو مجھے اس وقت آیا جب میں نے اپنے پیروں پر کتے کی بھونکنے کی آواز سنی اور پھر وہ ظالم، میرے سنبھلنے سے پہلے ہی میری دائیں ٹانگ پر اپنی "حیوانیت" کا ثبوت دے کر فرار ہو گیا۔

بیری جانسٹن کے مطابق اکتوبر ۱۹۹۸ کا ذکر ہے، پشاور میں پاکستان کے خلاف دوسرے ٹیسٹ کے دوران، آسٹریلوی کپتان مارک ٹیلر نے عظیم بلے باز سر ڈونلڈ بریڈمین کے ۳۳۴ رنز کے اڑسٹھ سالہ پرانے آسٹریلوی ٹیسٹ ریکارڈ کو توڑ دیا۔ اگرچہ ٹیم نے اسے اگلی صبح بلے بازی جاری رکھنے کے لیے اختیار دے دیا، لیکن ٹیلر نے ریکارڈ برابر کرنے کے بعد اپنی ٹیم کی اننگز کو ختم کرنے کا اعلان کیا۔ ڈان، جو اس وقت نوے سال کا تھا، نے ٹیلر کو مبارکباد کا ایک ٹیلیگرام بھیجا تھا۔ اسی دوران آسٹریلیا میں مشہور اخبار "کوڈر پیپر" کے لیے ایک اخباری اشتہار شائع ہوا، جس میں مبارکباد دیتے ہوئے لکھا گیا تھا "ٹیلی، شکر ہے کہ آپ دوبارہ رنز بنانے لگ گئے ہیں!"

''کہاں ہو بھئی۔۔۔چلنا نہیں ہے کیا۔۔۔؟'' اقبال کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں خیالات کی دنیا سے واپس حقائق کی دنیا میں لوٹ آیا۔تھوڑی دیر بعد ہم دونوں پروفیسر ڈنگ ڈونگ کے دروازے پر کھڑے بیل بجا رہے تھے۔بیل کے جواب میں ایک عدد بچے کے دیدار کی سعادت نصیب ہوئی جو کہ انسان کا بچہ کم اور چڑیا کا زیادہ لگتا تھا۔ہم نے کہا کہ پروفیسر صاحب سے ملنا ہے تو وہ ہمیں ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا واپس چلا گیا۔پندرہ منٹ کے معمولی سے انتظار کے بعد وہ بچہ دوبارہ نمودار ہوا اور ہمیں گائیڈ کرتا ہوا ایک کمرے میں لے گیا جو غالباً ڈرائنگ روم تھا۔دروازے پر پہنچ کر بچے کا اور ہمارا عارضی ساتھ ترخ کی خاموش آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا اور بچہ ہمیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے واپس مڑ گیا۔ہم جیسے ہی کمرے کے اندر داخل ہوئے تو میری نظر کمرے کے وسط میں فرش پر پڑی ایک گٹھری پر پڑی۔ابھی میں اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک اقبال کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی ''اخاہ، پروفیسر صاحب ورزش کر رہے ہیں۔۔۔''

میں نے حیرت اقبال کی طرف دیکھا کہ ابھی چند لمحے پہلے تک تو بالکل ٹھیک تھا، اچانک اسے کیا ہو گیا کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ کمرے ہمارے علاوہ اور کوئی بھی نہیں تھا لیکن جب میں نے اقبال کی آنکھوں کا تعاقب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ گٹھری آہستہ آہستہ حرکت کر رہی ہے۔آنکھوں کا سائز دوگنا کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ گٹھری دراصل ایک جیتا جاگتا انسان ہے اور ''یوگا'' کے مخصوص آسن میں یعنی دایاں پاؤں بائیں ران کے نیچے، بایاں پاؤں دائیں ران کے نیچے رکھ کر سر کو ٹانگوں سے ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔مجھے یقین کامل ہو چلا تھا کہ پروفیسر صاحب کی عظیم روح بھی اس ''گٹھری نما بدن'' کی قید میں ہے ورنہ عام آدمی تو اس طرح کے کام کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔اقبال کی آواز سن کر پروفیسر صاحب نے اٹھ کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن دونوں ٹانگیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے کی وجہ سے ''لم لیٹ'' پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ہم جلدی سے آگے بڑھے اور پروفیسر صاحب کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کیلئے بیرونی امداد مہیا کی جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور تھوڑی دیر بعد ہی پروفیسر صاحب صوفے پر بیٹھے لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔

''میں معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کو تکلیف ہوئی۔۔۔دراصل ہوا یوں کہ میں سر کو ٹخنوں سے ملا کر، دونوں ہاتھوں کو سر کے پیچھے لا کر ناک کے دونوں نتھنے بند کر کے سانس لینے کی مشق کر رہا تھا لیکن شاید سانس لینے کے لئے میں اپنا منہ کھولنا بھول گیا تھا جس کی وجہ سے میرا دم گھٹنے لگا تھا۔یہ تو شکر ہے کہ آپ لوگ وقت پر پہنچ گئے ورنہ تھوڑی دیر بعد ہی دنیا ایک عظیم اور قابل ترین پروفیسر سے محروم ہو جاتی تھی جس کا مجھے قیامت تک افسوس رہتا۔'' پروفیسر صاحب نے اپنی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا اور میں سر کھجاتے ہوئے اقبال کی طرف دیکھنے لگا جو پہلے ہی بڑے آرام سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔

''پروفیسر صاحب!'' اقبال ان سے مخاطب ہوا۔''یہ میرے عزیز ترین دوست ہیں اور انہیں بھی آپ کے پسندیدہ مضامین میں بے حد دلچسپی ہے۔یہ آپ سے شرف ملاقات حاصل کرنا چاہتے تھے۔امید ہے کہ اپنے وافر قیمتی وقت میں سے آپ ہمیں چند گھنٹے ضرور عنایت کریں گے۔''

''کیوں نہیں جناب، کیوں نہیں۔میں تو خود ہی ایسے مہمانوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔۔۔ارے او، شرفو! جلدی سے چائے لے آؤ اور وہ جو پچھلے مہینے بازار سے میں بسکٹ کا ڈبہ لے آیا تھا، وہ بھی آج لے ہی آؤ۔۔۔''

پروفیسر صاحب خوشی میں شاید اپنی کنجوسی کے سارے ریکارڈ توڑنے پر تلے ہوئے تھے اور ہم پر پروفیسر صاحب کی عظمت کے نئے راز فاش ہو رہے تھے۔۔۔تفصیلی تعارف اور ادھر ادھر کی

باتوں کے بعد میں نے پروفیسر صاحب سے پوچھا ''پروفیسر صاحب! ٹیلی پیتھی کیا چیز ہوتی ہے؟''

''ٹیلی پیتھی دراصل ایک ایسا فن ہے جس میں بنیادی اہمیت ''خیالات کی لہروں'' کو ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کے ذہن سے نکلنے والی خیالات کی لہروں کی مدد سے میں بغیر آپ سے پوچھے بتا سکتا ہوں کہ آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے۔۔۔؟'' پروفیسر صاحب نے بڑے فاخرانہ انداز میں کہا۔

''یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ آپ بغیر ہم سے پوچھے یہ بتا دیں کہ ہماری آمد کا مقصد کیا ہے؟'' میں نے جان بوجھ کر حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''اگر بتا دوں تو پھر تو یقین لوگے۔۔۔؟'' پروفیسر صاحب نے گویا مجھے چیلنج کرتے ہوئے کہا، اس دوران اقبال بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

''جی ہاں، پھر میں واقعی تسلیم کرلوں گا کہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے ایسا ممکن ہے اور کہ آپ اس فن میں واقعی ماہر ہیں۔''

میں نے پروفیسر صاحب کو بانس پر چڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔ پروفیسر نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور مراقبے میں چلے گئے۔ میں نے اقبال کی طرف دیکھا تو وہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا شاید یہ سوچ کر کہ اگر واقعی پروفیسر کو ہماری آمد کا اصل مقصد یعنی چائے پینے کے لئے آنے کا علم ہوگیا تو پتہ نہیں ہمارا کیا حشر کرے گا لیکن میں اپنی جگہ مطمئن تھا کیونکہ مجھے ٹیلی پیتھی کے بارے میں تھوڑی بہت شدبد پہلے ہی حاصل تھی اور میں نے اپنے ذہن کو ان الفاظ پر مرتکز کیا ہوا تھا کہ مجھے آج دو ہفتے بعد اچانک ہی ٹوائلٹ کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اور قرب وجوار میں اور کوئی ٹوائلٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے آپکے گھر کا رخ کیا ہے۔۔۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں نے پروفیسر کے چہرے کی رنگت تبدیل ہوتے دیکھی اور اس کے متغیر ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ پروفیسر نے واقعی میرے ذہن سے نکلنے والے سگنل وصول کر لئے ہیں۔ مگر اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرا ذہن بھی کچھ سگنل وصول کر رہا ہے۔ میں نے مزید توجہ کی تو معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب کہہ رہے ہیں۔۔۔ ''میرے تو اپنے گھر کا گٹر تین دن سے بند پڑا ہے اور پچھلا گراؤنڈ بھی ''پر'' ہو چکا ہے۔''۔۔۔ اسی لمحے پروفیسر نے اچانک آنکھیں کھولیں اور یوں گویا ہوئے۔

''معذرت خواہ ہوں کہ چند غیر اخلاقی وجوہات آپ کی یہاں



ظالمو! اس وقت بحث و تکرار کا کون سا وقت ہے، تم نے توحکومت اپوزیشن کی لڑائی کو بھی مات دے دی ہے۔

آمد کا اصل باعث ہیں، جو میں بوجہ شرم نہیں بتا سکتا۔"

اب میرے ذہن میں بھی کن کھجورے رینگنے لگے اور میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح یہ کنفرم کرلوں کہ میرے ذہن نے جو سگنل وصول کیے ہیں کیا وہ بھی صحیح ہیں یا غلط؟ چنانچہ میں نے وہی موضوع چھیڑتے ہوئے پروفیسر سے پوچھا۔

"پروفیسر صاحب! آپ بھنگی کو کیا تنخواہ دیتے ہیں؟"

پروفیسر کے جواب دینے سے پہلے اقبال بول پڑا۔"یار! بیروزگاری اپنی جگہ، لیکن اپنی سطح سے تو نہ اترو۔۔۔"

میں جواب دینے لگا تھا کہ پروفیسر صاحب بول اٹھے "اُس کمبخت کا نام بھی نہ لو میرے سامنے۔۔۔تین دن سے میرے کا گٹر بند پڑا ہے اور وہ اپنے "باپ کے سر سے سینگ" کی طرح غائب ہے۔"

میں اندازے کی درستگی پر دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔ اسی اثنا میں اقبال نے انتہائی انوکھی بات کی "پروفیسر صاحب! آپ اسے ٹیلی پیتھی کے ذریعے کیوں نہیں بلا لیتے۔۔۔؟"

پروفیسر صاحب حیرت اور خوشی سے اچھل پڑے، کہنے لگے۔"کمال ہے، یہ آئیڈیا میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟"

"ذہن ہوتا ہو تو آئیڈیا بھی آجاتا ہے، پروفیسر صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اقبال دوسری طرف منہ کر کے ہنسنے لگا جبکہ پروفیسر صاحب اپنی آنکھیں بند کر کے ایک دفعہ پھر مراقبے میں جا چکے تھے۔۔۔تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولتے ہوئے بولے "وہ کسی شادی پر گیا ہوا تھا، ابھی واپس آیا ہے۔۔۔ساتھ ہی اس کا گھر ہے، ابھی تھوڑی دیر میں ہی گھر پہنچ جائے گا۔"

چند لمحوں بعد اچانک ہی دروازہ دھڑام سے کھلا اور ایک آدمی کچھے میں ملبوس جھاڑو اٹھائے اندر داخل ہوا۔ ہم نے مارے شرم کے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اچانک ہی پروفیسر کی چیختی چنگھاڑتی آواز سنائی دی جو بیچارے بھنگی پر برس رہے تھے "کم بخت! شرم نہیں آئی تمہیں اس لباس میں اندر آتے ہوئے اور کہاں مر گئے تھے تم اتنے دن؟۔۔۔اگر مرنا ہی تھا تو بتا کر تو مرتے، میرا مطلب ہے کہ بتا کر تو جاتے۔۔۔بول کیوں نہیں رہے۔ جلد بکو، کہاں تھے اتنے دن۔۔۔؟"

> ڈکی برڈ کے بیان کے مطابق کیتھ ملر جنگ سے پہلے اور بعد کے عظیم آسٹریلوی کرداروں میں سے ایک تھا۔ وہ کچھ بھلکو سا بھی واقع تھا۔ ایک بار جب اُس کی ٹیم میدان میں اترنے کے لیے بالکل تیار تھی تو کسی نے اُس سے پوچھا کہ فلاں کھلاڑی کہاں ہے؟
>
> "کوئی پتہ نہیں" کیتھ نے کندھے اُچکائے "کیا وہ اس میچ میں کھیل رہا ہے؟"
>
> "بالکل!" جواب آیا "اُس کو گھر سے لانے کا ذمہ آپ نے ہی تو لیا تھا!"

وہ بیچارہ بڑے مسکین لہجے میں بولا۔"جناب! میں دراصل اپنی ساس کی چوتھی شادی پر گیا ہوا تھا اور ابھی واپس پہنچا تھا۔ غسل خانے میں کھڑا کپڑے تبدیل کر رہا تھا کہ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے آپ مجھے بلا رہے ہوں کہ جیسے ہو اور جہاں ہو کی بنیاد پر فوراً میرے پاس پہنچو۔ میں سمجھا کہ شاید آپ دنیا سے اپنی ٹکٹ کٹوا چکے ہیں اور یہ آپ کی بدروح۔۔۔میرا مطلب ہے کہ روح کی آواز ہے اس لیے میں "ٹک ٹٹ، ٹک ٹٹ" دوڑتا ہوا یہاں پہنچا ہوں مگر آپ تو بالکل صحیح وسالم بیٹھے ہیں۔۔۔" آخر میں اس کی آواز سے مایوسی نمایاں طور پر جھلک رہی تھی۔

"چلو، دفع ہو جاؤ اور اپنا کام کرو۔" پروفیسر صاحب چلائے اور آدمی کمرے سے نکل گیا۔

پھر میں نے باتوں باتوں میں "ٹیلی پیتھی" کا تمام طریقہ کار، اس کی ورزشیں، اس کی احتیاطیں وغیرہ پروفیسر سے معلوم کر

لیں کیونکہ اسی دوران میں فیصلہ کر چکا تھا کہ ٹیلی پیتھی ہی اب وہ واحد طریقہ ہے کہ جس میں مہارت حاصل کر کے میں اپنی فرحین کو واپس حاصل کر سکتا ہوں۔۔۔ چائے پینے کے بعد ہم نے پروفیسر صاحب سے اجازت طلب کی۔

”اچھا پروفیسر صاحب! اب ہمیں اجازت دیجیئے۔“ اقبال نے اٹھتے ہوئے کہا، میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ سے آئندہ بھی ملاقات رہے گی۔۔۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔۔۔!“ پروفیسر صاحب نے مجھے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا

”کیوں نہیں، جناب! اب تو اکثر آپ سے ملاقات رہے گی۔“

اقبال نے بھی پروفیسر صاحب سے الوداعی کلمات کہے اور ہم دونوں مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔

آج پروفیسر سے ملاقات کئے ہوئے پورے ایک سو بیس دن گزر چکے تھے اور ساتھ ہی اتنی راتیں بھی اور اس پورے عرصے میں ٹیلی پیتھی پر عبور حاصل کرنے کیلئے میں پروفیسر کی بتائی ہوئی مشقیں کرتا رہا تھا۔ میں روزانہ رات کو بستر پر لیٹنے کے بعد سانس کی مخصوص ورزشیں کرتا تھا اور پچھلے ایک ماہ سے میرا معمول تھا کہ رات کو سوتے ہوئے سانس کی ورزش کے بعد میں اپنے دماغ کو فرحین کے چہرے پر مرکوز کر لیتا تھا اور اس قسم کی باتیں سوچتا رہتا تھا کہ فرحین! تم نے مجھے ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا، میں تم سے واقعی سچی محبت کرتا ہوں اور تمہارے عشق میں واقعی پاگل ہو چکا ہوں۔ اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں اپنی جان دے دوں گا اور تم پچھتاتی رہ جاؤ گی اس لئے شام پانچ بجے اپنے گھر کے سامنے مینٹل ہاسپٹل کے لان میں مجھ سے ملو اور محبت کا جواب محبت سے دو وغیرہ وغیرہ۔

روزانہ شام پانچ بجے مینٹل ہاسپٹل کے لان میں بیٹھنا میرا معمول بن چکا تھا کہ اگر واقعی خوش قسمتی میرے دروازے پر دستک دیتی تو اسے مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اسی چکر میں میرے کئی پاگلوں سے قریبی تعلقات بھی قائم ہو چکے تھے لیکن آج میں بہت مایوس ہو چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ شاید میری ساری محنت ضائع گئی اور حاصل کچھ نہ ہوا۔۔۔ میں لان میں بیٹھا یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک میری آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ لہرایا، میرا انگ انگ مسرت سے بھر گیا کیونکہ یہ چہرہ میں ہزاروں تو کیا، لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ فرحین ہی تھی، میں نے اسے پکارنا چاہا لیکن آواز میرے گلے میں ہی رندھ گئی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف بڑھ رہی ہے۔ دھیرے دھیرے، ہولے ہولے وہ میرے قریب آ رہی تھی اور میری دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی جا رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ندامت تھی اور میرے چہرے پر خوشیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر، آج مجھے یقین ہو چکا تھا کہ خدا کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔۔۔ وہ میرے قریب پہنچ کر رک گئی، اس کا سر نیچے جھکا ہوا تھا، وہ آہستہ آہستہ میرے قدموں کی طرف جھکنے لگی، میں سمجھ گیا کہ وہ یقیناً میرے قدموں میں بیٹھ کر اپنا جیون گزارنا چاہتی ہے مگر اس کی جگہ میرے قدموں میں نہیں بلکہ میری دل میں تھی، میری آنکھوں میں تھی، اسی لئے میں اس کو اٹھانے کے لئے نیچے جھکا لیکن اچانک پتہ نہیں کیا ہوا، زمین لرزنے لگی اور آسمان گھومنے لگا۔ یوں لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو، میں دھڑام سے نیچے زمین پر گر پڑا۔ میرے ذہن میں ستارے تو کیا، پوری کائنات رقص کرنے لگی۔۔۔ ہوش وحواس ذرا بحال ہوئے تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔۔۔ فرحین میری ٹانگ کھینچ کر مجھے گرانے کے بعد خراماں خراماں چلتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی شاید اس یقین کے ساتھ کہ میں بھی پاگل ہو چکا ہوں جبکہ میں زمین پر پڑا، دیدے گھماتے ہوئے سوچ رہا تھا ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

روبینہ شاہین بیناؔ

غریب اپنے سٹیٹس کے ہاتھوں مارا گیا
ہوا جو عشق میں رانجھا، وہی کنوارہ گیا

ہوا یہ حال بھی شادی کے بعد شوہر کا
بچا جو ماں سے تو بیوی کی مار مارا گیا

پسر کی شادی پہ اماں نے آہ بھر کے کہا
لو آج میرے بڑھاپے کا بھی سہارا گیا

بحال ہونے چلی تھی طبیعتِ بیمار
وہ ڈاکٹر کی مگر فیس سن کے مارا گیا

سفارشوں سے وہ کھیلا تھا اپنا آخری میچ
چمک رہا تھا جو کرکٹ میں وہ ستارا گیا

یہ شہر شہر خوشاں ہے اس کے جانے سے
چلی جو کار تو سب نے کہا کھٹارا گیا

تمام رات فضاؤں میں بوٹیاں گونجیں
ڈنر لذیذ تھا لیکن بڑا ڈکارا گیا

لٹک رہا تھا وہ کھمبے کی تار سے بیناؔ
پتنگ باز کو کوٹھے سے جب اتارا گیا

روبینہ شاہین بیناؔ

بازیچۂ خیال کا منظر اتار دے
غالب سا فیس بک پہ سخن ور اتار دے

ایسی جگہ اتار کہ نسوار بھی ملے
مرنے سے پہلے مجھ کو پشاور اتار دے

سن سن کے اُک گئی ہوں فضیلت میں جوس کی
ٹھیلے سے جا کے کوئی سپیکر اتار دے

جاری رہے گی کب تک یہ آہ و فغاں بھلا
اِن شاعروں کے دل سے دسمبر اُتار دے

جاری رہے گی کب تک یہ آہ و فغاں بھلا
ان شاعروں کے دل سے دسمبر اُتار دے

جعلی سند میں بی اے تو لکھا ہے مگر
قوسین میں لکھا ہوا (آنر) اتار دے

پپو نے گھر کو دشت بنانا ہے اس لیے
اس کو بھی ایک ریت کا ڈمپر اتار دے

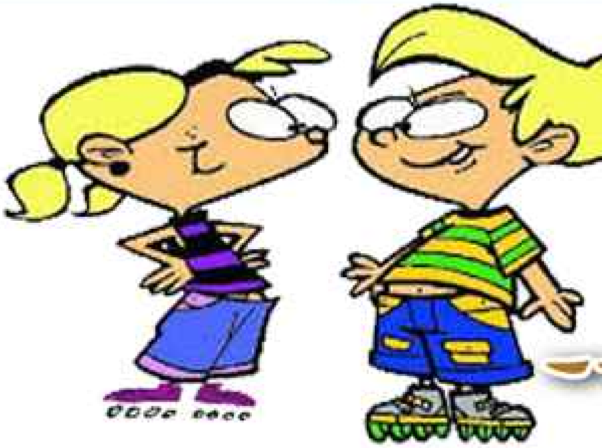
اُن کو بھی ہو بخار تو کوئی دوا نہ ہو
ڈینگی برادران سا مچھر اُتار دے

برباد ہو رہی ہے مری نسل نو یونہی
کالج میں کوئی عشق کا ٹیچر اُتار دے

ویگن میں ہو رہا ہے مرا دم اِدھر اُدھر
مجھ کو نہ راستے میں کنڈکٹر اتار دے

دِل اس کا بھی پھڑکتا ہے یخنی کے واسطے
بیناؔ کی چھت پہ آج کبوتر اُتار دے

محمد رفیق



بچے ہمارے عہد کے...

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

مندرجہ بالا اشعار مرحومہ شاعرہ پروین شاکر نے آج سے کئی برس پہلے اپنے عہد کے بچوں کی چالاکی کے بارے کہے تھے۔ آج اگر وہ زندہ ہوتیں اور اِس عہد کے بچوں کی چالاکیاں (بلکہ یوں کہیے کہ مکّاریاں) دیکھتیں تو شاید انھیں اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑتا۔

ویسے میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی ہے کہ ایک معصومانہ (دن کے وقت جگنو کو پرکھنے کی) ضد کی بنا پر مرحومہ شاعرہ نے اپنے دور کے بچوں پر اتنا بڑا الزام کیوں عاید کیا۔ ممکن ہے بچے جگنو کے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار ہوں اور انھیں کوئی خاتون سمجھ رہے ہوں جو رات کو آ کر گھروں میں اپنے جلوے بکھیرتی ہو اور صبح دم بچوں کے اُٹھنے سے پہلے ہی غائب ہو جاتی ہو (یہ ایک مفروضہ ہے جس کی وضاحت شاعرہ اگر خود کرتی تو بہتر تھا)۔ عام طور پر حقیقی جگنو بھی دن کو نظر نہیں آتے پتا نہیں رات کو کہاں سے نمودار ہوتے ہیں اور دن کو کہاں غائب ہو جاتے ہیں (یہ ایک حل طلب معمہ ہے)۔

خیر بات ہو رہی تھی بچوں کی چالاکی پر اور میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں کہ اگر شاعرہ مرحومہ اس دورِ پرآشوب میں زندہ رہتی تو آج کے بچوں کی چالاکیاں دیکھ کر انھیں پتا چلتا کہ دراصل اُن کے دور کے بچے تو نہایت معصوم اور سیدھے سادھے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آج سے دس سال بعد (اگر ہم زندہ رہے) ہمیں بھی اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑ جائے۔

مرحومہ شاعرہ کے زمانے میں اِنفارمیشن ٹیکنولوجی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی اور فور جی ٹیکنولوجی متعارف نہیں ہوا تھا جس کی وجہ سے بچوں کے ہاتھوں میں اسمارٹ فون نہیں ہوتے تھے۔ آجکل والدین اپنی آسانی کے لیے بچوں کے لیے پچاس پچاس ہزار والے اسمارٹ فون خرید کر انھیں بچوں کے (یا بچوں کے اُن کے) حوالے کرتے ہیں جس کی وجہ سے بچے اپنی دنیا میں اور والدین اپنے معاملات میں مشغول رہتے ہیں اور اِس طرح گھر میں سکون رہتا ہے۔

اسمارٹ فون پر موجود انٹرنیٹ کی سہولت نے بچوں کے آئی کیو لیول کو چوتھی گئیر لگا دی ہے اور ان کا دماغ 'اوکٹا کور' پروسیسر کی طرح کام کرنے لگا ہے جس کے ساتھ ہی اُن کی خود اعتمادی میں بھی غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اب بچوں کو کہانی قصے سنا کر بہلایا نہیں جا سکتا۔ جیسے پرانے زمانے میں جب بھی کسی گھر میں نئے بچے کی ولادت ہوتی تو امّی پہلے والے بچے کو کہتی کہ کل رات آسمان سے ایک فرشتہ تمھارے لیے ننھی بہن یا بھائی گھر میں چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور سیدھا سادا بچہ ماں کی اس من گھڑت کہانی پر یقین کر لیتا۔ یہی سوچ کر ایک ماں نے اپنے آٹھ سالہ بیٹے کو

آنے والے بچے کے متعلق یہی کہانی سنائی جس کے جواب میں بیٹھے نے کہا "رہنے دیجیے امی! مجھے پتا ہے یہ سب ابو کی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔" لہٰذا بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں اب والدین کو بچوں کو انڈر اسٹیمیٹ نہیں کرنا چاہیے اور ان کے ساتھ سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیے تاکہ انھیں سبکی نہ اٹھانی پڑے۔

ایک اور ذہین بچے نے، جس کی عمر تقریباً سات سال تھی، ایک دن اپنے والدین سے اپنے لیے الگ کمرے کا مطالبہ یہ کہہ کر کیا کہ آپ لوگوں کی شرارتوں کی وجہ سے میری پرائیویسی کمپرومائز ہو رہی ہے اور مجھے پب جی گیم کھیلنے میں جو یکسوئی چاہیے، وہ نہیں مل رہی۔ ماں باپ سمجھدار تھے، وہ سمجھ گئے کہ بچہ اصل میں کیا کہنا چاہ رہا ہے لہٰذا انھوں نے یہی بہتر جانا کہ بچے کو فوراً الگ کمرے میں سُلا دیا جائے تاکہ انکی اپنی پرائیویسی بھی خراب ہونے سے بچ جائے۔

اس دور کے بچوں میں بلا کی خود اعتمادی پائی جاتی ہے، مشکل سے مشکل حالات میں بھی انھیں کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں جو کچھ یوں ہے کہ ایک بچہ اسکول کے سالانہ امتحان میں فیل ہو گیا مگر بالکل بھی نہیں گھبرایا بلکہ اطمینان سے گھر گیا، شام کو جب انکے ابُو تھکے ہارے گھر پہنچے تو بچے نے (اس سے پہلے کہ ابُو نتیجے کے بارے میں سوال کرتے) انھیں دروازے پر ہی جالیا اور ان کے درمیان جو مکالمے ہوئے بہتر ہے من وعن آپ خود ہی پڑھ لیں تو زیادہ بہتر ہے۔

بچہ: ابو جب کبھی آپ امتحان میں فیل ہوتے تو دادا ابا آپ کے ساتھ کیا سلوک کرتے؟

ابُو: بیٹا ایسی صورت میں وہ مجھے خوب مارتے اور دو دن تک بھوکا رکھتے۔

بچہ: ابُو اگر آپ مجھ سے تعاون کریں تو ہم مل کر اس خاندانی غنڈہ گردی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر سکتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ بچے نے کس طرح کمال ہوشیاری سے ایک خاندانی جھگڑے کا خاتمہ کیا۔ اسی طرح کی خود اعتمادی کا ایک واقعہ اور بھی ہے جس میں ابو نے اپنے آٹھ سالہ بیٹے سے جو موبائیل پر فائیر فری گیم کھیلنے میں مگن تھے ایک گلاس پانی لانے کو کہا۔ بچے نے اشارے سے منع کیا جس سے ابو کو بہت غصہ آیا قریب تھا کہ وہ بچے کو اس جسارت پر تھپڑ رسید کرتے، دوسرا بیٹا جس کی عمر دس سال تھی (وہ بھی صوفے پر بیٹھے انسٹا گرام دیکھنے میں مصروف تھا) ابا کو کہنے لگا "ابو چھوڑیے ناں! یہ تو بدتمیز ہے، آپ اسطرح کریں کہ جا کر فریج سے خود بھی پانی پی لیں اور ایک گلاس میرے لیے بھی لیتے آئیں۔ دیکھا آپ نے بچے کی ذہانت اور خود اعتمادی کہ کس طرح ایک گھمبیر مسئلے کو پل بھر میں حل کر دیا۔

سوشل میڈیا کے اس تیزی سے ترقی کرتے ہوئے دور کو اگر بچوں کا دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں پیدا ہونے والے بچے سمارٹ فون کو اپنے والدین سے زیادہ بہتر طریقے سے ہینڈل کر سکتے ہیں۔ بلکہ اکثر والدین اسمارٹ فون پر موجود مختلف ایپس استعمال کرنے یا پلیٹ فارمز (فیس بک، ٹویٹر، انسٹاگرام، وغیرہ) پر اکاؤنٹس کھلوانے کے لیے اپنے بچوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ بچے اتنے بدمعاش ہوتے ہیں کہ اپنے والدین کا پاس ورڈ اپنے پاس سیو (محفوظ) کر لیتے ہیں اور بعد میں چوری چھپے امی ابو کے سوشل میڈیا ایکٹیویٹیز کی جاسوسی کرتے رہتے ہیں اور انھیں ہوا تک بھی لگنے نہیں دیتے۔ کچھ بچے اتنے شریر ہوتے ہیں کہ ابو اور امی کو بلیک میلنگ سے بھی باز نہیں آتے بلکہ انکی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر ان سے اپنے جائز ناجائز مطالبات پورے کرواتے ہیں۔ امی کو دھمکی دیتے ہیں کہ ابو کو انکی سوشل میڈیا سرگرمیوں کے بارے میں سب بتا دیں گے جبکہ ابو کو اس کے برعکس دھمکی دیتے ہیں۔ مُشتری ہوشیار باشد۔

بعض دفعہ یہ سیدھے سادھے والدین مختلف سرچ انجنوں

(جیسے گوگل، یاہو، ایم ایس این وغیرہ) کے ذریعے اپنے مطلب کی ویب سائٹ کی ویزٹ کرتے ہیں لیکن ان کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ویب سائٹ ویزٹ کی براوزنگ ہسٹری بنتی ہے۔ یہ مکّار بچے ان کی بے خبری کا فایدہ اُٹھا کر براؤزنگ ہسٹری سے پتا چلاتے ہیں کہ امّی ابو کے رجحانات کس طرح کے ہیں اور پھر ان کو ان کے رجحانات کے مطابق ہینڈل کرتے ہیں۔

بعض بچے اتنے ذہین وفطین ہیں کہ انھوں نے سوشل میڈیا کے ذریعے اپنے گھر کے معاشی حالات میں بہتری لائی ہے۔ ایک ایسا ہی واقعہ کے بارے میں مجھے پتا چلا ہے جو میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بچے کا والد کام چور اور نکھٹو تھا جو سارا دن گھر پر رہ کر امّی کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ گھر والے اس کی اس ہڈحرامی سے پریشان تھے کیونکہ گھر کے معاشی اور معاشرتی حالات دن بدن بدسے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ خوش قسمتی سے بچے کا ایک دوست سوشل میڈیا میں بڑا ایکٹیو تھا، ایک دن بچے کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا کہ کیوں نہ ابا کو ایک ٹِک ٹاکر بنا کر پیسہ کمانے پر لگا دیا جائے۔ یہ آئیڈیا آتے ہی بچے نے اپنے دوست کے ذریعے یوٹیوب پر ابا کا اکاؤنٹ کھلوا دیا اور دوست کے گیجٹ سے ابا کے ٹِک ٹاک بنانے شروع کیے۔ ابا پڑھا لکھا نہیں تھا اور انھیں بات کرنے کی تمیز بھی نہیں تھی لیکن بچہ نہیں گھبرایا اس نے ابا سے کہا کہ تمھیں بس اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنی ہیں اور عجیب وغریب آوازیں نکالنی ہیں (ان چیزوں کا تو وہ ماسٹر تھا)۔ پھر کیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے ابا (اپنی بیہودہ حرکتوں کی وجہ سے) یوٹیوب پر مشہور ہوگئے۔ ان کے چینل کو سبسکرائب کرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی، جس میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی اور یہاں تک کہ ٹی وی پر نشر ہونے والے مارننگ شو میں اسے مدعو کیا جانے لگا۔ اس سے نہ صرف ابا مشہور ہوگئے بلکہ گھر کے معاشی اور ابا کے ازدواجی حالات بھی بہتر ہونے لگے۔ ابا کی کامیابی کو دیکھ کر (اور ان سے حسد کھا کر) امّی بھی اسی لائن میں آگئی۔ انھوں نے بھی یوٹیوب پر اپنا ایک الگ اکاؤنٹ کھلوایا۔ امّی کے چینل سبسکرایب کرنے والوں کی تعداد ابو سے بھی بڑھ گئی مگر ابو کے برعکس امّی کو لائیک کرنے (چاہنے) والوں میں زیادہ تر نوجوان لڑکے شامل ہیں۔ اِس طرح ایک ذہین بچے نے ابا اور امّاں کو ایک نئے دھندے پر لگا دیا جس سے نہ صرف وہ مشہور ہوگئے بلکہ گھر کی آمدنی میں بھی خوب اضافہ ہوگیا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ والدین کو اِس دور کے بچوں کی چالاکیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنی حکمتِ عملی میں تبدیلی لانی پڑے گی۔ اب روایتی طریقوں سے بچوں کو بہلانا پھسلانا ممکن نہیں رہا۔ جہاں تک اسمارٹ فون استعمال کرنے کا سوال ہے تو والدین اوّل ایسے کام نہ کریں جس سے انھیں بچوں کے ہاتھوں شرمندگی اٹھانی (اور بعض اوقات بلیک میلنگ کا سامنا کرنا) پڑے۔ اور اگر یہ افعالِ خبیثہ اتنا ہی ضروری ہیں تو پھر انھیں اپنے آپ کو نئی ٹیکنولوجی سے ہم آہنگ کرنا پڑے گا۔ مختلف ایپلیکیشنز کا استعمال، پلیٹ فارمز پر اکاؤنٹ کھولنے کے طریقے، ویب سائٹ کی براؤزنگ وغیرہ کے بارے میں ٹریننگ لینی ہوگی اور ہوسکے شارٹ کورسز کرنے چاہیں تاکہ بچوں پر ان کا انحصار کم سے کم ہو۔ بچوں کے ساتھ اپنا پاس ورڈ بالکل شئیر نہیں کرنے چاہئیں، کیونکہ بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے ہیں۔



سعید رضا

اُس کی آنکھوں میں گرمی ہو گی
وٹامن "اے" کی ہی کمی ہو گی

لوڈشیڈنگ یونہی رہی تو پھر
دُور کیسے یہ تیرگی ہو گی

پلس مانگے گی جا بجا پرمٹ
یہ تو توہینِ میکشی ہو گی

جبکہ پیٹرول اتنا مہنگا ہو
خاک پھر ہم سے عاشقی ہو گی

چٹھی جو تیرے نام لکھی تھی
ہاتھ ابا کے لگ گئی ہو گی

سب کے ہونٹوں پہ خامشی ہو گی
نیٹ کی ترسیل رک گئی ہو گی

سعید رضا

یاد آنے لگی جوانی کیوں
پھر سے تصویر وہ پرانی کیوں

ووٹ خود پی ٹی آئی کو دے کر
یاد آنے لگی ہے نانی کیوں

شوق سے تو بیاہ کے لائے تھے
بوجھ لگنے لگی "زنانی" کیوں

کوئی بتلاؤ رنگ پیڑوں کا
سردیوں میں ہے ارغوانی کیوں

کر دیا ستیا ناس پکنک کا
ساس ٹپکی ہے ناگہانی کیوں

بن گئے جبکہ خواہشوں کے غلام
شور کیسا کہ ہے گرانی کیوں

مرد "رن آؤٹ" ہو نہیں سکتا
کر رہے ہو غلط بیانی کیوں

اظہر عزمی کراچوی

کراچی والوں سے لو زبان کے چٹخارے



روزمرہ بولے جانے والے الفاظ اور جملے

کراچی کی ہر بات نرالی ہے۔ بقول مشتاق احمد یوسفی اُلٹے ہو کر دیکھو تو شہر سیدھا نظر آتا ہے۔ کراچی والوں کی اپنائیت کی چاشنی سے لپ ریز روزمرہ گفتگو سیدھی مگر تیکھی ہے۔ کبھی تو یہ ایک لفظ ہوگا یا پورا جملہ یا پھر ایک ایسا لفظ جس کا کوئی مطلب نہ ہوگا لیکن وسیع المطالب اور جامع المعانی ہوگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ الفاظ اور جملوں میں تبدیلی اور اختراع کا عمل جاری رہتا ہے جو کہ شہر والوں کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔ کراچی والوں کی منفرد بات یہ ہے کہ ان کے چہروں پر ایک مخصوص مسکراہٹ اور ناراضی (اگر ہے) ہوتی ہے۔ کراچی والوں کا لہجہ، الفاظ اور جملے دنیا میں کہیں بھی با آسانی شناخت میں آجاتے ہیں۔

کراچی والوں کا ایک خاص مزاج ہے جب آپ اپنے دوستوں اور اپنے ہم عمر رشتے داروں کے نام کے ساتھ "صاحب" لگادیں اور گفتگو آپ سے شروع ہو جائے تو سمجھ لیں کہ آپ پر کسی سبب طنز کے تیر چلائے جا رہے ہیں۔ ابے، چل، اچھا، سن، واہ، تیری تو وغیرہ اس روانی اور اپنائیت سے بولے جاتے ہیں کہ کوئی محسوس بھی نہیں کرتا۔

زبان کے چٹخارے کی یہ فہرست مختصر ہے۔ اس میں اضافے کی بڑی گنجائش ہے۔ کراچی کے کچھ علاقوں کے اپنے چٹخارے ہیں جن کا ذائقہ پورے کراچی والوں نے بھی چکھا۔ بڑا شہر ہے، بڑی باتیں ہیں اور سب کے لیے دل سادہ و کشادہ ہے۔

۱۔ **ٹوپی**: شہر والے اتنی پہنتے نہیں جتنا بولتے ہیں۔ ویسے میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ یہ شہر اتنا کچھ جھیلنے اور سہنے کے باوجود ٹوپی باز نہیں۔

۲۔ **ماموں**: یہ لفظ رشتے داری سے زیادہ تعلق داری میں بولا جاتا ہے۔ کہیں کہیں لگتا کہ کسی کو احمق ظاہر کر رہا ہے لیکن اب کثرت استعمال سے یہ اپنائیت کے زمرے میں آگیا۔

۳۔ **لڑکے**: آپس کی گفتگو میں پیار بھرا اظہار ہے۔ لڑکا کہنے میں عمر کی قید ضروری نہیں۔ واحد شرط یہ ہے کہ مخاطب زندگی کی قید میں ہو۔

۴۔ **چاچا**: یہ بڑی عمر کا اظہاریہ ہے لیکن کبھی کبھی یہ سامنے والی کی کم عقلی کے اظہار کا بھی ذریعہ ہے۔

۵۔ **او بھائی**: بہت وسیع الاظہار ہے۔ آپ پیار، محبت، غصے میں کہیں بھی بول سکتے ہیں۔ اس کا سارا صورت حال کو دیکھتے ہوئے آواز اور لہجے سے عیاں ہوتا ہے۔

۶۔ **بہت بڑی فلم ہے**: یہ دوسرے کی کارگزاری کا آئینہ دار ہے۔ اعتراف اور اعتراض دونوں کا غماز ہے۔

۷۔ **کیا سین ہے**: صورت حال سے متعلق جانے

کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۸۔ **تو اس کو چھوڑ**: جب دوسرے کی باتوں سے بور ہو جائیں یا موضوع بدلنا ہو۔

۹۔ **سائیڈ پکڑلو**: مطلب یہ کہ جان چھڑاو، ایک طرف ہو جاؤ۔

۱۰۔ **تو کیا کرلے گا؟**: صورت حال پر منحصر ہے۔ لڑائی سے لے کر سمجھانے تک کہیں بھی بولا جاتا ہے۔

۱۱۔ **ہلکا لے رہا ہے**: یہ جملہ بھاری اور ہلکے وزن کا کوئی بھی شخص کہہ سکتا ہے۔ اس سے مراد صلاحیت پر شک رفع کرنا ہوتا ہے۔

۱۲۔ **تو تو نکل**: دخل در نامعقولات پر کہا جاتا ہے یا ایسے موقع پر کہ جب کسی کو کسی مسئلے سے نکالنا یا الگ کرنا ہو۔

۱۳۔ **یہ کس چکر میں ہے؟**: کسی ایسے شخص کے لئے کہ جو بلاوجہ یا غیر ضروری طور پر کسی بات یا معاملے میں دخل اندازی کر رہا ہو یا اس کا حصہ بن رہا ہو۔

۱۴۔ **تو کچھ بھی کرلے**: مطلب یہ کہ تیری چلنی نہیں ہے۔ بیکار میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔

۱۵۔ **اب کرنا کیا ہے؟**: یہ سوال ایکشن کا متقاضی ہے۔ حالانکہ ہونا ہوانا کچھ نہیں۔ کہنے والا گفتار کا غازی ہے۔

۱۶۔ **ابے کیا... سمجھ رہا ہے**: یہ جملہ اتنا بولا جاتا ہے کہ گنتی میں نہیں آتا ہے۔ خالی جگہ کو آپ سامنے والے سے تعلق اور حفظ مراتب کے تعلق سے بھر اور کہہ سکتے ہیں۔

۱۷۔ **اس کو بتا دینا**: یہ دوسرے شخص کو تنبیہ کے لئے متعلقہ شخص کی عدم موجودگی میں بارے دھڑلے سے بولا جاتا ہے۔ اس جملے کی دھمک میں دھمکی چھپی ہے۔

۱۸۔ **بہت بڑا ڈرامے باز ہے**: متعلقہ شخص کی حقیقت معلوم ہے۔ احمق سمجھنے لیس بنانے کی چنداں ضرورت نہیں چندا۔

۱۹۔ **بہت فنکر ہے**: زمانے بھر کا چال باز ہے۔ کیا سمجھتا ہے ہمیں پتہ نہیں۔

۲۰۔ **چھم چھم کرالو**: ایسے شخص کے لئے جو محفل لگانے یا نام و نمود کا شوقین ہو۔

۲۱۔ **ائے ویں آئی**: یہ کراچی والوں کی خاص ادا ہے جو گفتگو میں ادا کرتے ہیں۔ مراد ہے کہ بے مقصد کوئی فائدہ نہیں۔

۲۲۔ **اڑ گئے**: الف پر پیش لگالیں۔ یہ انداز تخاطب کراچی کی بڑی بوڑھیوں کا ہے جو اب متروک ہوتا جا رہا ہے۔ مذکر کے لئے اڑ گئے اور مونث کے لیے اڑ گئی۔ استعمال کا تعلق موڈ پر ہے۔

۲۳۔ **بات تو کر کے دیکھ**: کسی ایسے شخص کے لئے جو ماننے کو تیار نہ ہو۔

۲۴۔ **گھوما تا بہت ہے**: ایسا شخص جو بات ماننے کے بجائے آئیں بائیں شائیں کرتا ہو۔

۲۵۔ **چراندی**: ایسا شخص جو کسی بھی وقت مسئلہ کھڑا کر سکتا ہو۔ ایسے شخص کو گند بھی کہا جاتا ہے۔

۲۶۔ **پکاؤ**: ایسا شخص جو بہت بولتا ہو اور بار بار دہراتا ہو کہ کان پک جائیں۔

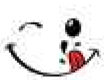
۲۷۔ **کیا بولا؟**: یہ عام گفتگو یا اظہار ناراضی پر بولا جاتا ہے۔

۲۸۔ **کھوپڑی گھما دیتا ہے**: غصہ دلاتا ہے۔ مزاج کے خلاف بات کرتا ہے۔

۲۹۔ **شوم**۔ ش پر پیش لگا کر پڑھیں: اس کا مطلب ہے کہ بڑا کنجوس، مکھی چوس اور خرچ میں ہاتھ روک ہے۔

۳۰۔ **ٹیکسی کرانا**: جھگڑے کے موقع پر کسی شخص کو بحفاظت وہاں سے نکالنا۔

یہ فہرست ابھی نامکمل ہے۔ آپ مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔





مسلمانوں کے نام

رمضان آنے والا ہے خبردار جو تاجروں نے کوئی چیز سستی کی پہلے کی طرح دگنے ریٹ پہ بیچنا رمضان میں ہر عمل کا ثواب دگنا ہو جاتا ہے تو منافع بھی تو دگنا ہونا چاہیے تاکہ رمضان کی برکتیں زیادہ سے زیادہ سمیٹی جا سکیں۔ کافر تو بے وقوف ہیں جو اپنے اور مسلمانوں کے تہواروں پہ چیزیں سستی یا مفت کر دیتے ہیں۔ اسی طرح روزے کے دوران بے ایمانی غیبت رشوت بدنظری اور دھوکے وغیرہ سے پرہیز کی بھی بالکل ضرورت نہیں نماز روزہ جو رکھتے ہیں ان چھوٹے موٹے گناہوں کی بخشش کے لیے کافی ہے۔

آخری درویش لامکانی

ٹھیکے دارانِ ادب کے نام

ہم آپ کو مطلع کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے اپنی تمام شاعری منظر عام پر لانے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے ممکن ہے آپ ہمارے اس فیصلے کو ادب کی ڈوبتی ہوئی ناؤ میں ایک نئے سوراخ سے تعبیر کریں اس لیے ہم بر وقت بتا رہے ہیں کہ اگر آپ ہمیں اس انتہائی قدم سے باز رکھنا چاہتے ہیں تو فوری طور پر ہمارے لیے کسی معقول روزگار کا بندوبست کریں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ورنہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں شاعری کا بیڑہ پار کرنے سے نہیں روک سکتی اس صورت میں ہماری ڈھائی من بے وزن اور بہت ہی زیادہ آزاد شاعری سے عوام کے پاگل ہوجانے کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہوگی جس کے لیے تاریخ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی لیکن اگر آپ ہمیں بر سر روزگار کر دیں تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اپنی تمام منقولہ و غیر منقولہ شاعری سے دست بردار ہوجائیں گے۔

من شاعرِ بے روزگار غریب آبادی
مجاہد ادیب شیخ

جانِ ڈھائی من کے نام

دیکھو میری جان رمضان آنے والا ہے یہ تمھارے لیے سنہرا موقع ہے کہ پورے روزے رکھ کر فالتو چربی زائل کر کے دوبارہ جانِ من بن جاؤ۔ ثواب کا ثواب اور ڈائٹنگ کی ڈائٹنگ یاد ہے پچھلی بار جب تم بائیسکل کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھی تھیں تو اگلا پہیہ اوپر اٹھ گیا تھا اور ہم کیا زوروں سے گرے تھے مذاق بھی اڑا تھا اور بائیسکل کا نقصان الگ ہوا تھا آئندہ ایسا نہ ہو۔

بابا شوقی۔ دھمال نگر

بیگم کے نام

آج یکم ہے اور یقیناً اب تک تم میں وہ انقلاب آچکا ہوگا جو پورا مہینہ تلقین کے باوجود نہیں آتا۔تم گھر کو صاف ستھرا کر کے بننے سنورنے میں مصروف ہوگئی کہ ایک ہی وار میں کام تمام کر کے تنخواہ برد کرسکو۔صبح سے تمھاری زبان سے شہد ٹپک رہا ہوگا اور تم کئی بار اماں جی کے پاؤں دبا اور ابا جی کو چائے بنا کر دے چکی ہوگی۔بچوں کو مل مل کے نہلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنا چکی ہوگی اور باورچی خانے سے یقیناً میرے پسندیدہ کھانوں کی مہک اٹھ رہی ہوگی مگر۔۔افسوس کہ آج تمھاری یہ ساری محنت دھری کی دھری رہ جائے گی کیونکہ میں دفتر سے ہی ایک دوست کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی طرف جارہا ہوں اور تنخواہ ختم ہونے کے بعد ہی واپس آؤں گا چھٹی میں نے لے لی ہے اس لیے میرا انتظار مت کرنا۔

کے ایچ عابد

علامہ اقبال کے نام

کاش آج آپ زندہ ہوتے تو ہم شاہینوں کو دیکھ کر کس قدر خوش ہوتے کہ ہم نے آپ کی محبت کا حق دار بننے کے لیے آپ کے فرمان پر کیسے آنکھیں بند کر کے حرف بہ حرف عمل شروع کر دیا ہے۔ ہمیں اپنے گلی محلے تو کیا شہر بھر میں جہاں کوئی ستارہ نظر آتا ہے ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس پہ کمندیں ڈالنا شروع کر دیتے ہیں اس میں ہم اپنے کالج یا یونی ورسٹی کو بھی حائل نہیں ہونے دیتے اور ستاروں کے کالج کے باہر بھی ڈیوٹی دیتے ہیں اور باقی کسر سوشل میڈیا پر پوری کرتے ہیں۔ یہ تو آپ ہی کہہ گئے تھے نا کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں شاہین بچوں کو خاک بازی کا درس دیا جاتا ہے ظاہر ہے پھر ہم وہاں کیوں جائیں گے۔ ہم تو ہمہ وقت اپنے مشن کی تکمیل کے لیے پلٹنے جھپٹنے میں مصروف رہ کر لہو گرم رکھتے ہیں یہی تو فرمان تھا نا آپ کا۔ آپ واقعی حکیم تھے لہو گرم رکھنے کا اس سے بہتر نسخہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم آپ کے فرمان کے مطابق کارِ آشیاں بندی کے جھنجھٹ میں بھی پڑتے اور اکثر پہاڑوں کی چٹانوں پر ہی بسیرا کرتے ہیں۔ ہم آپ کے باقی فرامین پر بھی اسی طرح عمل کر کے دکھائیں گے۔

خادم حسین مجاہدؔ

حکومت کے نام

پیاری حکومت! ہم شکر گزار ہیں کہ آپ نے سگریٹ کی قیمتیں دُگنی کر دی ہیں۔ اس سے اب غریب لوگ سگریٹ پینے کی جرات نہیں کر سکیں گے یوں اُن کا پیسہ اور صحت بچے گی اور وہ یہ رقم آٹا گھی وغیرہ خریدنے میں صرف کر سکیں گے۔ رہ گئے امیر لوگ تو وہ سگریٹ خرید کر حکومتی خرچے پورے کرنے میں معاونت کریں گے۔ دیگر اشیائے ضروریہ کی مہنگائی سے بھی قومی کفایت شعاری کا کلچر پیدا ہوگا جس سے ملک خوشحالی کی منزلیں تیزی سے طے کرے گا۔ آپ کو اپنی عیاشیاں اور بیورو کریٹوں، ججوں اور جرنیلوں کی لامتناہی مراعات بھی بند کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، انھیں پورا کرنے کے لیے آپ عوام کا جتنا بھی خون نچوڑیں گے وہ اتنے ہی جوش و خروش سے "آوے گا بھی آوے گا" اور "زندہ باد" کے نعرے لگائیں گے۔ آخر قربانی کے بکرے ہوتے کس لیے ہیں۔

مسز توتی فرام نقار خانہ



۱۹۴۸ء میں ہجرت کے زخموں سے چور قوم کے دِلوں پہ مرہم رکھنے کے لیے جناب وحشی مارہروی مرحوم نے تیس روزہ چاند کے نام سے ایک مزاحیہ ماہانہ پرچہ جاری کیا بعد میں مزاح میں جتنے بھی لوگ نامور ہوئے انھوں نے لکھنے کا آغاز اسی سے کیا۔ وحشی مرحوم اور پیر جنگلی کی زندگی میں اوران کے بعد ان کے بیٹوں خالد بن حامد اور مسعود حامد کی ادارت میں بھی کافی عرصہ اس کا کبھی ناغہ نہیں ہوا لیکن پھر بعض مسائل کی وجہ سے ناغے ہونا شروع ہوئے اور ہوتے ہوتے ۲۰۱۲ء میں ہمارا یہ محبوب پرچہ دم توڑ گیا۔

اس سانحے نے چکوروں کے دل توڑ دیے۔ اکثر نے لکھنا چھوڑ دیا اور جو کچھ ڈھیٹ تھے انھوں نے دیگر رسائل کی راہ لی لیکن دل سے چاند کو کبھی نہ نکال سکے۔ دس سال بعد قومی ایوارڈ یافتہ مصنف ناول نگار شاعر اور مزاح نگار ارشاد العصر جعفری نے چکوروں کو دوبارہ اکٹھا کرنے کا سوچا اور اُدیب اور مزاح نگار خادم حسین مجاہد کے ساتھ مل کر چاند کے نام سے سوشل میڈیا پہ واٹس ایپ گروپ تشکیل دیا۔ رفتہ رفتہ بچھڑے ہوئے ملتے گئے اور چاند کو نیٹ پر برقی شکل میں جاری کرنے کا فیصلہ ہوا اور اس کی ذمہ داری تیکھے لہجے کے معروف مزاحیہ اور سنجیدہ شاعر اور کئی برقی کتب کے مصنف نوید ظفر کیانی صاحب کے کندھوں پہ ڈالی گئی کیونکہ وہ ارمغانِ ابتسام کے نام سے پہلا مزاحیہ برقی مجلہ کئی سال چلانے کا تجربہ رکھتے تھے۔ معروف شعراء سید فہیم الدین اور محمد عاطف مرزا نے بھی ان کی معاونت کی ہامی بھری اور یوں ای چاند کا پہلا شمارہ منظر عام پہ آیا۔ گو اس میں چکوروں کی حاضری توقع سے کم رہی اور کچھ چکورا بھی تک گم شدہ ہیں جو شاید حالات کے ہاتھوں اب تک گول ہو چکے ہیں۔ امید ہے آئندہ شماروں میں یہ کمی پوری ہو جائے گی اور چکور جوق در جوق اور جوک در جوک شامل ہو کر رسالے کی شان بڑھائیں گے۔

آپ سے گزارش ہے کہ رسالہ پڑھ کر اس کی تحریروں پہ چاند ماری ضرور کریں اور اس کے دل چسپ سلسلوں میں حسب توفیق حصہ بھی لیں اور اسے مزید دل چسپ بنانے کے لیے تجاویز اور تحاریر سے نوازیں تاکہ رسالہ خوب سے خوب تر اور خوب ترین کی طرف گامزن ہو سکے۔

آخری درویش لامکانی


یہ جگہ
آپ کے کاروبار کے اشتہار کے لئے مختص ہے
موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے رابطہ کیجئے
mudeerchand@gmail.com